

# چیدہ چیدہ

مختلف مصنوعات پر دلچسپ اور دلکش کہانیاں چیدہ چیدہ کے  
عنوان سے آپ ہر شمارے میں عالمی ادب کے مختلف شاہکار پڑھتے ہیں۔  
انداز کا ایک مقبول اور منفرد سلسلہ

## سودا

### ایس ایم سراج الحق

انہی دنوں کی بات ہے۔

ایک دن مائیکل نے مجھے بتایا کہ وہ ایک نیا شکار تیار کر رہا ہے، جو بہت مالدار ہے لہذا ممکن ہے کہ اس بار ہم ایک لمبا بزنس کر سکیں! وہ کوئی مالدار بیوہ مسز چارلس تھی، جس سے مائیکل کی ملاقات ٹیکس آفس میں ہوئی تھی۔ کسی بات پر وہ کلرک سے الجھ پڑی تھی۔ مائیکل بھی وہیں موجود تھا۔ اس نے فوراً مداخلت کی اور اس کی معاونت کی بدولت مسز چارلس کا مسئلہ حل ہو گیا، وہ اس کی بے حد شکر گزار ہوئی، مائیکل تو اس موقع کا مستطرب ہی تھا۔ اس نے فوراً ہی اسے شام کو کلب میں مدعو کر لیا، وہ آمادہ ہو گئی۔ یہ ان کی پہلی ملاقات تھی، جلد ہی ان کے درمیان ربط و ضبط برپا ہو گیا۔ یا دوسرے الفاظ میں خود مائیکل ہی اس کی طرف جھکا تھا۔ دو ایک بار مسز چارلس نے اسے اپنے گھر پر مدعو بھی کیا۔ ان کی ملاقات برابر جاری رہی پھر ایک دن مائیکل نے مجھے بتایا کہ مسز چارلس نے اس سے کاروباری امور میں مدد دینے کی گزارش کی ہے۔ اس طرح اسے اس کے مزید قریب ہونے کا موقع مل گیا، وہ کافی مطمئن تھا، اور اسے امید تھی کہ جلد ہی وہ اسے شیشے میں اتار سکے گا۔ لیکن ایک دن مائیکل جب مجھ سے کلب میں ملا تو وہ کچھ کبیدہ خاطر تھا۔ اس نے بتایا کہ انتہائی مالدار ہونے کے باوجود وہ اوّل درجہ کی کنجوس عورت ہے! نوکروں میں صرف اس کے پاس ایک باورچی ہے، اس کی کنجوسی کا یہ عالم ہے کہ گرمی کے زمانے

وہ بھی بڑا دلچسپ زمانہ تھا۔ جب میں مائیکل کے ساتھ مل کر مارو بار کیا کرتا تھا۔ اس زمانے کی کئی کاروباری ناکامیاں جب ہمیں یاد آتی ہیں تو ہم گھنٹوں محفوظ ہوتے رہتے ہیں۔ اس وقت ہم دونوں ہی کاروباری معاملات میں بالکل نئے تھے۔ مائیکل تو پھر بھی کچھ تجربہ کار تھا۔ لیکن میں ان معاملات میں بالکل ہی کوزا تھا۔ اس لیے اکثر ہماری بنائی ہوئی اسکیمیں یا تو ناکام ہو جاتی تھیں، یا پھر ہم کسی بڑی مشکل میں پھسنے سے بال بال بچتے تھے۔ دراصل مائیکل کا جاگتا ہوا ذہن جلد ہی کوئی حل سوچ لیا کرتا تھا۔ آہا ٹھہریئے میں اس کاروبار کی ٹوٹ تو ظاہر کر دوں! جی ہاں! وہ کوئی معزز پیشہ نہیں تھا۔ بس یہی کہ ہم دوسروں کو جل دے کر اپنا مقصد پورا کر لیا کرتے یا پھر عام فہم الفاظ میں یہ سمجھ لیجئے کہ ہم دوسروں کے ساتھ فراڈ کیا کرتے تھے۔ ان دنوں ڈیوڈ کا کلب ہم دونوں کے لیے مشاورتی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہم وہیں بیٹھ کر پروگرام بنایا کرتے تھے۔ اور نفع و نقصان کا اندازہ لگایا کرتے تھے۔ عام زندگی میں ہم دونوں کی حیثیت نہ صرف معزز تھی بلکہ ہمارا شمار سوسائٹی کے سربراہ و درہ افراد میں ہوا کرتا تھا۔ اونچی سوسائٹی میں ربط و ضبط قائم رکھنا ہمارے لیے ویسے بھی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر ہم اپنے بنائے ہوئے پروگرام کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتے تھے! اور ہم دونوں کی زیادہ تر یہی کوشش ہوا کرتی تھی کہ ہم زیادہ سے زیادہ اجنبیوں سے قریب ہو سکیں۔

میں وہ اپنا بنگلہ بھی لوگوں کو کرایے پر دے دیتی ہے! کیونکہ اونچائی پر ہونے کے باعث لوگ اسے زیادہ قیمت پر حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ وہ خود ایک چھوٹے سے کمرے میں منتقل ہو جایا کرتی تھی۔

مائیکل وقتاً فوقتاً مجھے اس کی کنجو سی کے بارے میں بتایا کرتا تھا۔ ایک شام اس نے کہا۔ ”یہ مسز چارلس بھی انتہائی طبیعت سورت ہے۔ ایک طرف تو اس کی کنجو سی کا یہ عالم ہے کہ وہ انتہائی ضرورت کے باوجود کوئی ملازم نہیں رکھتی ہے، اور دوسری طرف اپنی پالتو بلی گریٹا پر اتنا خرچ کرتی ہے جتنا سال بھر میں خود اپنی ذات پر بھی خرچ نہیں کر پاتی؟“

اس روز وہ کافی غصے میں تھا وہ بار بار اس بات کا ذکر کر رہا تھا کہ وہ اس کو ضرور کب پہنچائے گا تاہم اس وقت اس نے کافی سخت سے کام لیا۔ وہ برابر اس کے ہمراہ لگا رہا۔ اس دوران ہم دوسرے امور کی طرف متوجہ ہو گئے۔ لیکن مسز چارلس کا مسئلہ بھی چلتا رہا، کیونکہ مائیکل کا خیال تھا کہ وہ ایک موٹی آسامی ہے، اس لیے اس سے آسانی کے ساتھ الگ نہیں ہوا جاسکتا۔

ایک شام جب میں گھر پہنچا تو مائیکل مجھے منتظر ملا۔ وہ کافی ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا، مجھے دیکھ کر وہ ہنستے ہوئے بولا ”تھیں وہ سعادت یا دہے نا۔؟ مسز چارلس؟“

”ہاں۔ ہاں۔ کیوں کیا ہوا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔  
”اب تک تو کچھ نہیں ہوا البتہ اب بہت کچھ ہو جائے گا۔ اگلے ہفتے وہ اپنا بنگلہ کرائے پر اٹھا رہی ہے، چونکہ میں نے اس کے کٹا کاروباری امور سلجھا دیئے ہیں، اس لیے وہ چاہتی ہے کہ بنگلہ کرائے پر اٹھنے سے قبل میں وہاں رہ کر گرمیوں کا لطف اٹھاؤں۔ ہاں ایک بات میں تمہیں بتانا بھول گیا آج سے قبل میں نے اس کا بنگلہ پوری طرح نہیں دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ کافی لمبا پوڑا حصہ بطور سیرگاہ استعمال ہوتا ہے اور ایک بڑا سوئمنگ پول اپنی خوبصورتی کے باعث کافی مشہور ہے اکثر لوگ محض اس سوئمنگ پول ہی کے لیے مسز چارلس کے قریب ہونے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ سورت ہر کسی سے کرایہ وصول کرنے سے سوئمنگ پول جلنے کی اجازت دیتی ہے؟“

”پھر تمہارا خیال ہے؟“ میں نے جلدی سے پوچھا کیونکہ تیرا کی میرا محبوب مشغلہ تھا!

”خیال کیسا؟“ وہ بولا ”لیں ہم دونوں یہ ہفتہ یہاں گزاریں گے، اتنے دنوں تک میں نے محض اسی لیے تو اس کے ساتھ جھک

ماری تھی۔“ پھر وہ سنجیدہ ہوتا ہوا بولا؟ ”دراصل اس دوران میں نے جو معلومات حاصل کی ہیں اس کے مطابق اسکا پاس پانچ ہیرول کا ایک جڑاؤ نکلس ہے، جس کی قیمت لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ پس ہمارا مقصد اسے حاصل کرنا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ اگر ہم اس مقصد میں کامیاب ہو گئے تو آئندہ کس بلین سالوں کے لیے کسی جدوجہد کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ میں اس کے ساتھ معمولی قسم کا فراہ کرنا نہیں چاہتا ہوں۔“

”لیکن میں کیونکر چل سکوں گا کیا تم نے اس کو میرے بارے میں بتایا ہے؟“

”نہیں لیکن اس نے خود ہی کہا ہے کہ اگر میں چاہوں تو اپنا کوئی دوست ہمراہ لاسکتا ہوں کیونکہ! اچانک اسے ٹھک جانا پڑا کسی نے دروازے پر دستک دی تھی، میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا! آنے والا مسز چارلس کا باورچی تھا! اس نے ایک لفافہ مائیکل کی طرف بڑھایا، اور جیب سے ایک چابی نکال کر اُسے دیتے ہوئے سلام کر کے رخصت ہو گیا! مائیکل خط پڑھ کر جیب میں ڈالتا ہوا بولا۔

”یہ اور بھی اچھی بات ہے معلوم ہوتا ہے قدرت کچھ زیادہ مہربان ہے۔“

”کیوں! کوئی خاص بات؟“  
”مسز چارلس اپنی بیمار سہیلی کو دیکھنے الیبا چلی گئی ہے، اس لیے اس نے معذرت کرتے ہوئے یہ بنگلے کی چابی بھیجی ہے تاکہ ہم اس کی غیر موجودگی کے باوجود اپنے پروگرام کے مطابق وہاں جاسکیں۔ اس نے خود موجود نہ ہونے پر افسوس و ندامت کا اظہار کیا ہے۔“ مائیکل لاپرواہی سے بولا ”اس کا موجود نہ ہونا بہت اچھا ہے، اب ہمیں اپنے کام میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔“

”لیکن؟“ میں جڑ بڑھتا ہوا بولا ”اس کی غیر موجودگی کی بنا پر ہمارا کھیل بگڑ بھی سکتا ہے۔ اس کا باورچی تو موجود ہی ہوگا؟“ میری اس بات پر

وہ کافی دیر تک ہنستا ہوا پھر کہنے لگا؟ ”اس بنگلے میں ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوگا۔ وہ باورچی کو سال میں ایک ماہ کی چھٹی دینے پر مجبور ہو گیا کہ اگر وہ ایسا نہیں کرے گی تو قانونی گرفت میں آسکتی ہے۔ وہ یہ چھٹی اس کو اس دوران دیتی ہے جب کرائے دار اس کے یہاں مقیم ہوتے ہیں۔ اور وہ ان سے پہلے ہی اپنے کھانے کا معاملہ طے کر لیتی ہے؟“

وہ خاموش ہو گیا، اب کسی اعتراض کی گنجائش نہیں تھی، لیکن وہ جانے کیوں میں کسی ان دیکھے خدشے کے پیش نظر مطمئن نہیں تھا۔ ہم میرا اس کے ساتھ جانا ضروری تھا۔ اسی شام ہم مسز چارلس کے آرام دہ بنگلے پر پہنچ گئے۔ مائیکل کے بیان کے مطابق حقیقتاً وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کے بنگلے نے مجھے کافی متاثر کیا! اسے بنگلہ کہنا بیجا تھا۔ وہ تو خوبصورت سی چھوٹی طویل تھی، آبادی سے فاصلے پر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر اس کی خوبصورتی کچھ اور بھی نکھر آتی تھی۔ وہاں ہر قسم کی آسائش موجود تھی! اس کا وسیع وسیع لان نہایت خوبصورتی سے سنوارا گیا تھا، جس کے بچوں، سیچ بنا ہوا سنگ مرمر کا حین سوئمنگ پول نہایت سادہ مگر سچا دلکش نظر آ رہا تھا! میں کچھ دیر باہر کے ماحول میں کھویا رہا! اس دوران مائیکل اندر جا چکا تھا، کچھ دیر بعد جب وہ باہر آیا تو بہت ہنسا شہنشاہی لہذا تھا، اس نے بتایا کہ اندر کے تمام کمرے کھلے ہوئے ہیں! اور ہم دونوں جہاں چاہیں با آسانی گھوم پھر سکتے ہیں۔

لیکن مجھے اُمید نہیں تھی کہ ہم اس کے جوہرات وغیرہ کا پتہ چلا سکیں گے، کیونکہ جو عورت خرچ کرنے کے معاملے میں کنجوسی کی حد تک محتاط ہو۔ وہ بھلا لاکھوں کے زیورات تحفظ کے بغیر کیونکر رکھ سکتی ہے، لیکن میں نے اس ضمن میں مائیکل سے کچھ نہیں کہا اور وہ بدستور خوشی خوشی بنگلے کا جائزہ لیتا رہا اندوہی حصہ بھی کافی متاثر کن تھا دیواروں کی آرائش و سجاوٹ کے ساتھ ساتھ عمارت کے چپے چپے سے امارت کا اظہار ہوتا تھا، یہاں کا یہ عالم دیکھ کر مجھے بے حد تعجب ہوا کہ مائیکل مسز چارلس کی کنجوسی کے متعلق باتیں کیا کرتا تھا! جب میں نے اس سے ذکر کیا تو وہ قہقہے لگاتا ہوئے بولا۔

”و ارے یہ سب اس کے سسر اور خاوند کا بنایا ہوا ہے، خود مسز چارلس نے تو اس میں کسی قسم کا بھی اضافہ نہیں کیا، البتہ یہ فرض ہے کہ اس نے ان سے آمدنی کا ذریعہ پیدا کر لیا ہے، حالانکہ اس کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ اگر شاہانہ انداز سے بھی خرچ کرے تو برسوں گزارہ کر سکتی ہے، اس کے کچھ قریبی دوستوں سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کے خاوند کے زمانے میں یہاں نوکروں کی پوری فوج موجود تھی! لیکن اس کے مرنے کے بعد اس نے سب کو نکال باہر کیا۔ یہاں تک کہ اب اس کے پاس صرف باورچی رہ گیا ہے“

وہ رات ہم نے یہاں نہایت اطمینان سے بسر کی، دوسرے دن ہم نے باقاعدہ جوہرات کی جستجو شروع کر دی، لیکن کئی گھنٹے

کی تلاش کے باوجود ہم کہیں سے بھی کوئی زیور تو کجا ایک سنگ بھی برآمد نہ کر سکے! مائیکل کافی مضطرب تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد بھی ہم نے اپنی تلاش جاری رکھی۔ آخر شام کے وقت مائیکل مسز چارلس کی خواب گاہ میں اس کی مسہری کے پیچھے ایک چھوٹا سا تہہ خانہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا، اس میں روپے پیسوں اور قیمتی زیورات کے علاوہ ایک چوکور بھاری سیف بھی تھا۔ مائیکل دوسری چیزوں کو نظر انداز کرتا ہوا اس کی طرف جھپٹا، شدت جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا، وہ نہایت بیقراری میں اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اُسے مایوسی ہی ہوئی۔ وہ حروف کے استخراج سے کھلنے والا کوئی معمولی سیف نہیں تھا! مائیکل کافی دیر تک کوشش کرتا رہا۔ اس دوران کئی بار میں نے بھی اپنے طور پر اُسے کھولنا چاہا، لیکن ہم دونوں ہی ناکام رہے۔ اچانک وہ رک کر سوچنے لگا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ سیف کو چاروں طرف سے الٹ پلٹ کر سیف بنانے والی فرم کا نام تلاش کرنے لگا۔ پیندے میں ایک جگہ کالی پٹی پر ”سپر سیف“ لکھا ہوا تھا۔ وہ سیف مسہری پر رکھتے ہوئے ٹیلیفون ڈائرکٹری کی طرف بڑھا۔ میں نے اندازہ لگایا وہ شاید سپر سیف کے نمبر تلاش کر رہا تھا! لیکن وہ کیا کرے گا! وہاں سے کسی میکانک کو بلائے گا! لیکن یہ تو بے حد خطرناک ہے! میں نے سوچا لیکن اس سے قبل کہ میں اسے اس کے اس ارادے سے باز رکھتا، وہ نمبر تلاش کر کے ٹیلیفون کا نمبر ملاتا ہوا مجھ سے بولا!

”میں وہاں سے میکانک بلوارہا ہوں“

”لیکن“ میں پریشان ہوتا ہوا بولا! ”یہ ایک غیر دانشمندانہ فعل ہوگا“

وہ میری بات نظر انداز کرتے ہوئے سیور میں بولا! ”ہیلو۔! سپر سیف۔ میں چارلس جونیر بول رہا ہوں۔ ہم نے آپ کے یہاں سے والی ۷۔ ماڈل کا ایک سوستر والا سیف خریدا تھا۔ اس میں کوئی خرابی ہو گئی ہے۔۔۔۔ میں ان کا بھتیجا بول رہا ہوں۔ جی ہاں! مسز چارلس موجود نہیں ہیں۔ آپ میری پوری بات تو سنئے۔ میں آج دوپہر ان سے ملنے آیا تھا، لیکن وہ موجود نہیں تھیں۔ شام کو جب میں ان کی خواب گاہ میں گیا تو وہاں ان کا سیف میز پر رکھا ہوا تھا اور اس کے قریب ان کی پالتو بلی بیٹھی ہوئی تھی۔ جی ہاں بلی بیٹھی ہوئی تھی! میں نے ابھی بڑھا دی تھی! ہو چکی تھی میں نے خوف زدہ ہو کر سیف کا جائزہ لیا تو۔ وہ بند ہو چکا تھا۔

پولیس سے امداد چاہی ہے، کیا وہ مظلوموں اور پریشان لوگوں کو امداد نہیں پہنچاتی ہے ہم بھی اس سے یہی چاہتے ہیں کہ وہ ایک بے زبان جانور کو مصیبت سے نجات دلا دے، ذرا سوچو تو وہ بیچاری بلی اب تک مرنے لگی ہوگی۔

بلی۔۔۔۔۔ بلی۔۔۔۔۔ بلی۔۔۔۔۔ میں نہیں سمجھ سکتا تمہارے دماغ میں کیا ہے؟ میں نے جھلاتے ہوئے کہا: ”سیف کھل جانے کے بعد لازماً اس میں سے بلی برآمد نہیں ہوگی، اس وقت کیا ہوگا کیا ہمیں پولیس شک و شبہ سے نہیں دیکھے گی؟“

”لیکن اس وقت ہم ایک ہلکی سی خفقت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیں گے، مائیکل شرادتی لہجے میں بولا: ”اوہ شاید مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اور تم کہو گے۔ بھائی جان آپ کو بھی دن میں خواب نظر آتے ہیں۔ کیا میں نے آپ کو نہیں سمجھایا تھا؟“ وہ خاموش ہو کر میری طرف آنکھیں میچتے ہوئے بولا: ”کیوں اب سمجھ گئے ننھے بچے میرا مطلب، اس کے بعد سارا معاملہ حل ہو جائے گا۔“

کیا خاک حل ہو جائے گا! سیف کھل جانے کے بعد اگر انھوں نے اسے دوبارہ ہماری تحویل میں دے دیا تو لازماً وہ اسے دوبارہ بند کر دیں گے، میں نے ایک اور دلیل دی۔ دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ ہم اس حد تک آگے بڑھیں! ”میں نے کب کہا کہ وہ سیف بند نہیں کریں گے، لیکن اس وقت تک میں سیف کھولنے کی ترکیب سے واقف ہو چکا ہوں گا اور اس کے بعد ہمارا راج ہوگا۔“

میں خاموش ہو گیا، اب میں اس کے ساتھ مزید بحث نہیں کرنا چاہتا تھا، مائیکل پولیس سے رابطہ قائم کر دیا تھا۔ مجھے اپنے ہاتھ پر جھولتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ تمام جسم میں سسٹنا ہٹ سی دوڑ گئی تھی۔ میں خاموشی سے مسہری پر نیم دلا ہو گیا اور مائیکل کو دیکھتا رہا۔ اس نے ہوشیاری سے مسہری کے پیچھے کا تہہ خانہ نیچے کر دیا تھا اور اب سیف کو مسہری پر رکھے ہوئے پولیس کی آمد کا منتظر تھا۔

کوئی بندرہ منٹ بعد میں صدد دروازے پر بچے والی گھنٹی کی آواز سن کر ہڑاڑ اٹھ بیٹھا، مائیکل بھی عجلت کے ساتھ اٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر بعد وہ دو سادہ لباس میں ملبوس پولیس افسران کے ساتھ اندر داخل ہو رہا تھا، ان میں سے ایک جون بٹا گھسیلے قد کا تھا! کمرے کے وسط میں رک کر اطراف کا جائزہ لیتا ہوا مائیکل سے بولا: ”میں پوری طرح نہیں سمجھ سکا تھا۔ آپ نے غالباً فون پر

میں نے کافی کوشش کی لیکن اسے نہیں کھول سکا! اب بیچاری بلی بندرہ منٹ سے اس میں بند پڑی ہے۔ پتہ نہیں زندہ ہے یا نہیں؟“ وہ میری طرف آنکھ مار کر مسکرایا۔ پھر وہ سنجیدہ ہو کر دوسری طرف سے کی جانے والی گفتگو سننے لگا۔ پھر وہ خاموشی سے رسیور رکھتے ہوئے بولا۔

ٹھیک ہے میں ان سے ابھی رابطہ قائم کرتا ہوں۔ ”کیوں؟“ میں نے اس سے پوچھا: ”وہ کیا کہہ رہا تھا؟“ ”وہ کہتا ہے کہ ہر سیف کا اصل فارمولا پولیس کسٹڈی میں رہتا ہے اور اس سیف کو جس کا فارمولا پولیس کسٹڈی میں ہو صرف پولیس کے نمائندے کے سامنے ہی کھولا جاسکتا ہے۔“ ”وہ پھر؟“ میں نے خوف کے باعث تھوک نگلتے ہوئے کہا: ”اب کیا کرو گے؟“

”کیا کرنا ہے؟“ وہ لبر واپسی سے بولا: ”ہم پولیس کو بھی بلوائیں گے۔“

”نہیں۔ نہیں۔“ میری حالت خوف سے تبدیل ہو گئی۔ ”میں اس کی اجازت نہیں دوں گا، میرے خدا اگر انہیں ذرا بھی شک ہو گیا تو ہم ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جائیں گے۔“ ”پھر کیا دولت یونہی مفت ہاتھ آجائے گی، خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔“

”لیکن آخر پولیس سے الجھنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟“ میں جھپٹے ہوئے لہجے میں بولا، پولیس تو خیر بعد کی چیز ہے اگر اس بڑھیا کو شک بھی ہو گیا تو وہ ہمارے اوپر الزام لگا دے گی۔“ ”میں اس بات پر پہلے ہی غور کر چکا ہوں۔ اول تو اس کو اس بات کا پتہ بھی نہیں چلے گا کہ وہ اپنے جواہرات سے محروم ہو چکی ہے، کیونکہ وہ ان کو کبھی استعمال نہیں کرتی، البتہ کبھی کبھار وہ ان کا جائزہ ضرور لیتی ہوگی۔ ان موقعوں کے لیے اگر ہم انہیں جواہرات کی نقل سیف میں رکھ دیں تو اسے کانوں کا خبر نہ ہوگی۔ اور تم کیا سمجھتے ہو اتنے دنوں تک میں اپنا وقت یونہی برباد کرتا رہا ہوں؟ میں نے اس حد تک اس کا اعتماد حاصل کر لیا ہے۔ کہ اگر اسے اس بات کا علم ہو بھی گیا کہ اس کے جواہرات چوری ہو گئے ہیں تو وہ مجھ پر شک کبھی نہیں کریگی البتہ شاید میری ہی معرفت پولیس کو اس گمشدگی کی اطلاع بھجوائے گی۔“

لیکن اگر پولیس کو شک ہو گیا کہ ہم مسٹر چارلس کے رشتہ دار نہیں ہیں یا اس وقت وہ خود آگئی ہو؟ ”یوں ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے، لیکن ہم نے

کسی بلی کا سوالہ دیا تھا جو کسی سیف میں بند ہو گئی ہے۔  
 ”جی ہاں جناب“، مائیکل آگے بڑھ کر سیف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہی کچھ دہرانے لگا، جو اس نے سپر سیف کے آدمی سے فون پر کہا تھا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا، اس کے خاموش ہو جانے کے بعد وہ حیرت سے بولا: ”لیکن تعجب کی بات ہے ہسٹر چارلس نے اتنی لاپرواہی سے اپنا سیف کھلا چھوڑ دیا“  
 ”غالباً جلدی میں وہ زیورات نکال کر اُسے بند کرنا بھول چکی ہوں گی۔ کیونکہ گھر میں کوئی دوسرا تو تھا نہیں، اور ہم تو یہاں موجود تھے ہی۔“

”ہاں یہ ہو سکتا ہے“، پولیس آفیسر نے میز پر سے سیف اٹھاتے ہوئے کہا۔ اسی وقت اس کا دوسرا ساتھی چونکتے ہوئے بولا: ”تم نے کیا کہا تھا ہسٹر چارلس؟ یہ وہی ہسٹر چارلس تو نہیں جو کی بلی گزشتہ دنوں غائب ہو گئی تھی اور انہوں نے کافی دن تک اسپیشل برانچ کے ممبران کو پریشان رکھا تھا! پھر پانچ سوڈا رول کا انعام مقرر کر کے وہ تھک ہار کر بیٹھ گئی تھیں!“  
 ”اوہ ہاں! تم نے ٹھیک یاد دلایا“، وہ مائیکل کی طرف آتا ہوا بولا: ”کیوں کیا یہ وہی بلی ہے؟“

”ہاں“، مائیکل جلدی سے بولا: ”شاید یہ اُن کی گریٹ ہی ہو، دراصل مجھے غور سے دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا، وہ فوراً ہی سیف میں کود گئی تھی۔“

”تب تو ہمیں جلد کوئی تدبیر کرنی چاہیئے، اگر ان کی بلی کو ہماری موجودگی میں کوئی گزند پہنچی تو وہ شاید اس بار پورے محکمہ پولیس کو ادھیڑ کر رکھ دیں“، گھٹیے قد کا آدمی مضطربانہ انداز میں بڑبڑایا، دوسرے ہی لمحے وہ کسی کو فون پر عمارت کا محل وقوع بتا کر جلد پہنچنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ ہم چاروں گم سم سے ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے، کم از کم میں نہایت مضطرب تھا، میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ سیف کھلنے کے بعد مائیکل کس طرح حالات پر قابو پائے گا! بہت ممکن ہے کہ پولیس کے ممبران وقت کی بربادی پر جھلائے ہوئے اس کے خلاف کوئی کارروائی کر بیٹھیں، کیونکہ سیف میں سے بلی تو نکلی تھی نہیں۔ ہم بے چینی سے نو وارد کی آمد کے منتظر تھے، اچانک دروازے پر گھنٹی بجی اور مائیکل جھپٹتا ہوا باہر نکلتا چلا گیا! جلد ہی اس کے ساتھ ایک آدمی اندر داخل ہوا وہ معمولی لباس میں تھا اور اس کے ہاتھ میں اوزاروں کا ایک بڑا بیگ تھا۔ اس نے ایک نظر سیف کی طرف ڈالی اور بغیر کچھ کہے سننے اس کی طرف متوجہ ہو گیا، ابھی اس نے سیف کا چاروں طرف سے

جائزہ ہی لیا تھا، کہ ہم سب چونک پڑے۔ میاؤں کی آواز اتنی واضح تھی کہ ہم سب نے صاف سُنا، بیک وقت دس نگاہیں کمرے میں پکڑائیں، اسی لمحے میاؤں کی دوسری آواز نے مائیکل کو بکھلا دیا، وہ سب تیزی سے چاروں طرف گھوم پڑے اور پھر سب سے پہلے میری نگاہ بلی پر پڑی۔ سفید جسم پر سنہری دھاریوں والی بلی اپنی بلور کی آنکھوں کے ساتھ گھر کی کے سب سے اونچے کارنس پر بیٹھی ہوئی بڑے مزے سے ہمیں دیکھ رہی تھی! میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے وہ سامنے آئے۔ ورنہ مائیکل سارا الزام میرے سر رکھ دیتا۔ پھر میکانک نے ہی اُسے تلاش کر لیا۔ مائیکل کے دو تین بار بچکارنے پر وہ با آسانی پیچھے اُتر آئی۔ بلاشبہ وہ انتہائی چمکیلی اور خوبصورت بلی تھی! اس کے گلے میں خوبصورت پٹہ بندھا ہوا تھا، پولیس افسران نے جواب طلب نگاہوں سے مائیکل کی طرف دیکھا، اور اسے فوراً ہی یاد آگیا کہ اس کو اس وقت اپنے اوپر خفقت طاری کر کے معذرت کرنی ہے وہ کہہ رہا تھا: ”مجھے افسوس ہے۔ شاید مجھ سے غلطی ہو گئی“، اب میری باری تھی میں فوراً ہی آگے بڑھا اور مائیکل کو مخاطب کرتا ہوا بولا: ”بھائی بھان! دیکھا میں نہ کہتا تھا یہ بھی کوئی بات ہے کہ بلی سیف میں گھس گئی ہے۔ آپ کو تو دن میں بھی خواب نظر آتے ہیں!“

اس نے پشیمان پشیمان سی نظروں سے پولیس افسران کی طرف دیکھا گھٹیے قد والے نے جاتے جاتے کہا: ”آئندہ ذرا محتاط رہا کیجئے ہمارا وقت بیک وقت قیمتی ہوتا ہے۔“

”مجھے علم ہے جناب“، مائیکل اپنے ہاتھ ملتے ہوئے بولا: ”مجھے اپنی غلطی پر ندامت ہے۔“

ان کو صدر دروازے سے رخصت کرنے کے بعد جب مائیکل واپس آیا تو اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔  
 ”وہ یہ تو کچھ بھی نہیں ہوا“، وہ بڑبڑایا۔

”نہ جانے کہاں سے یہ بلی عین وقت پر ٹپک پڑی ورنہ ہم نے تو میدان مار لیا تھا۔“ اس نے غصہ ناک نگاہوں سے بلی کی طرف دیکھا جو ایک میز پر نہایت متانت سے بیٹھی ہوئی اپنی دم صاف کر رہی تھی۔

نہ جانے کیوں میں مطمئن تھا! مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ سیف کھل نہیں سکا، کیونکہ کسی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا کم از کم میرے لئے ناممکن تھا، لیکن میں خاموش ہی رہا کیونکہ اگر میں اپنے

اس خیال کا اظہار مائیکل سے کرتا تو وہ ایک بار پھر مجھے آڑے ہاتھوں لیتا۔ وہ اکثر مجھے اس سلسلے میں ٹوکتا رہا تھا کہ میرے اندر کی شرافت ابھی تک مر نہیں سکی ہے۔

کچھ دیر بعد وہ گردن اٹھا کر بولا، ”میری اتنے دنوں کی محنت برباد ہو گئی، اب اگر میں تمہارے خاتمے کے بقیہ زیورات اڑاتا ہوں تو وہ قطعی بے کار ہوں گے، کیونکہ وہ زیادہ قیمتی نہیں ہیں، وہ خطرناک انداز میں کمرے میں بیٹھنے لگا۔ اچانک وہ رک کر میری طرف مڑتے ہوئے بولا، ”وہ پولیس میں کیا کچھ رہا تھا؟ مسز چارلس نے گریٹا کی بازیابی کے لیے کتنی رقم مقرر کی ہے؟“

”غالباً پانچ سو ڈالر“ میں اس کی طرف جواب طلب لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”بالکل ٹھیک ہے“ وہ اپنی جگہ سے اچھلتے ہوئے بولا۔

”اور ہم نے اب تک اس منصوبے پر کم و بیش اتنا ہی خرچ کیا ہے۔ اس لیے اب ہم پانچ سو ڈالر کا انعام تو ضرور حاصل کریں گے“ پھر وہ خاموش ہو کر سوچتا ہوا بولا، ”لیکن پانچ سو ڈالر کیوں؟ میں اس سے پانچ ہزار کیوں نہ طلب کروں۔“

”کیا مطلب؟“ میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے حیران لگا ہوں سے گھورتے ہوئے بولا۔

”جس طرح یہ بلی اچانک آگئی ہے اسی طرح وہ پھر غائب ہو سکتی ہے۔ کیوں؟“ وہ میری طرف دیکھ کر ایک بار پھر اپنے پرانے کھلڈرے موڈ میں واپس آتا ہوا بولا، ”چونکہ یہ بلی بڑھیا کو بے حد عزیز ہے۔ اس لیے اگر بلی کو غائب کرنے والا ایک بڑی رقم کا مطالبہ کرے تو وہ یقیناً وہ رقم ادا کرنے پر مجبور ہوگی۔“

”لیکن.... لیکن... میں یا تم اس سے کیوں کر ایک بڑی رقم کا مطالبہ کر سکتے ہیں جبکہ وہ تمہیں اچھی طرح جانتی ہے؟“ بس تم دیکھتے جاؤ، کل صبح میں پولیس اسٹیشن رنگ کروں گا کہ بلی پھر غائب ہو گئی ہے لہذا مسز چارلس کا مقرر کیا ہوا انعام بحال کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہم بلی کو اپنے پاس چھپا کر بڑھیا کو ایک خفیہ تحریر لکھیں گے کہ وہ اگر اپنی بلی کو زندہ سلامت چاہتی ہے تو دس ہزار ڈالر کی رقم جو انوں کے پارک میں فوارے کے پاس پہنچا دے، اور وہاں پر تم وہ رقم اس سے وصول کرو گے۔“

”مگر میں“ میں نے اس کی بات کاٹنی چاہی۔ لیکن وہ مجھے خاموش کرتا ہوا بولا۔ ارے بابا بولدی بات تو سنو، میں بھی وہیں

موجود رہوں گا! لیکن جہاں تک میرا خیال ہے کہ وہ اس چھپکے کے پیش نظر کہ اگر اس نے پولیس کو مطلع کرنے کی کوشش کی تو اس کی بلی کو ہلاک کر دیا جائے گا۔“ پولیس سے رابطہ قائم نہیں کرے گی، البتہ وہ مجھ سے ضرور اس بات کا ذکر کرے گی، اس لیے ہم فوراً ہی اس کے ارادے سے باخبر ہو جائیں گے، اگر وہ پولیس کے پاس جانے کے لیے بے قصد ہو گئی تو میں تمہیں باغ میں نہیں بھیجوں گا!“

”ہاں یہ ٹھیک ہے“ میں نے اطمینان کا سانس لیا اسی روز مائیکل نے مسز چارلس کو خط لکھ دیا اور دوسرے دن حسب پروگرام پولیس کو بھی اطلاع دے دی کہ بلی پھر غائب ہو گئی ہے۔

اسی روز مائیکل نے مجھ سے کہا کہ میں بلی سمیت گھر واپس چلا جاؤں۔ مجھے اس سلسلے میں پس و پیش تو نہیں تھا۔ البتہ اس بات کا خوف تھا کہ کہیں مجھے بلی سمیت پکڑ نہ لیا جائے کیونکہ پولیس کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی اس کی تلاش

میں دلچسپی لے رہے تھے، تاہم کسی نہ کسی طرح چھپتے چھپتے ہم دونوں گھر پہنچ گئے! اپنے کمرے پر پہنچ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور مائیکل مطمئن ہو کر واپس لوٹ گیا۔ مجھے بلی کو گھر کے دوسرے لوگوں سے بھی چھپانا تھا، میں کسی نہ کسی طرح اس ناخوشگوار مگر مالی منعقت والے کام کو انجام دیتا رہا۔ اسی طرح دو دن گزر گئے! اس دوران مائیکل مجھے برابر اطلاع دیتا رہا کہ مسز چارلس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آئی ہے۔ منگل کا دن قریب تھا لیکن اتوار کے دن میں نے محسوس کیا جیسے بلی کچھ سست نظر آرہی ہو۔ اس دن اس نے کھانے

سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اور پھر رات گئے اس کی حالت میں اچانک تغیر نمودار ہونے لگا۔ اس کا پیٹ جو پہلے بھی غیر معمولی طور پر پھولا ہوا تھا۔ کچھ زیادہ ابھر گیا، اس سے پہلے میں نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ میں نے فوراً ہی اس واقعہ کی اطلاع مائیکل کو دی کیونکہ اس کے مرجانے کی صورت میں ہمارے لیے رقم کی دھولیا بی ناممکن تھی! وہ جلد ہی میرے پاس پہنچ گیا! بلی کی حالت واقعی خراب ہو رہی تھی! مائیکل کا خیال تھا کہ گھنٹے ہوئے ماحول نے اس کی حالت خراب کر دی ہے۔ اس لیے وہ اس کو کسی ایسی جگہ لے جانے کے لیے سوچنے لگا۔

جہاں ہم اس کو آزادی سے رکھ سکیں، اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی، میں مائیکل کو مخاطب کر کے بولا، ”کیوں نہ آئے

جانوروں کے ہسپتال میں داخل کر دیں، یہ بیمار بھی ہے! اس طرح یہ صرف محفوظ رہے گی بلکہ اس کی دیکھ بھال بھی ہو سکے گی! یہ بات کی ہے تم نے؟ مائیکل پر جو جوش لہجے میں بولا اچلو ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیئے!۔

جلد ہی ہم جانوروں کے ہسپتال چلا پہنچے۔ ایک ڈاکٹر نے بلی کا معائنہ کرتے ہوئے مسکرا کر مائیکل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیوں جناب یہ بلی آپ کے پاس کب سے ہے؟“ ”کیوں کیا مطلب؟“ ہم دونوں ہی پریشان ہو گئے۔

”کوئی خاص بات نہیں غالباً اس کی میعاد دو تین ماہ سے زیادہ نہیں ورنہ آپ اتنے پریشان نہیں ہوتے“ وہ ایک بار پھر مسکرا کر ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ کی پیاری بلی امید سے ہے اور غالباً کچھ دیر بعد آپ چند خوبصورت بچوں کے سر پرست بن جائیں گے!“ پھر وہ سنجیدہ ہوتا ہوا بولا۔ ”یہ بلی بہت اعلیٰ نسل کی معلوم ہوتی ہے اس لیے اس کی دیکھ بھال ضروری ہے!“

ہم دونوں اسے خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ دراصل ہم نہیں چاہتے تھے کہ بلی اب دوبارہ ہمارے ساتھ واپس جائے۔ ہمیں خاموش دیکھ کر ڈاکٹر نے کہا: ”آپ لوگ چاہیں تو بلی کو واپس لے جائیں اور اسے آزاد چھوڑ دیں۔ قدرت نے ان کو ایسی صلاحیت ودیعت کر دی ہے کہ یہ اپنا کام خود انجام دے لیتی ہیں، اور اگر آپ چاہیں تو اسے یہاں داخل کروادیں!“

مائیکل نے فوراً ہی کہا: ”جی ہاں آپ اسے داخل کر لیجئے!“ دراصل یہ میری بیوی کو بچہ پسند ہے اگر اسے کچھ ہو گیا تو وہ دوبارہ بڑا حال کرے گی۔

”راہ آپ اطمینان رکھیں“ ڈاکٹر نے ایک ملازم کو آواز دے کر بلی اس کی تحویل میں دی اور خود ہم سے رقم وصول کر کے رسید بنانے لگا۔

ہم نے اطمینان کا سانس لیا، اور دوبارہ مسنر چارلس کے گھر روانہ ہو گئے، اب ہمارے سر سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا تھا، مائیکل نے سیف دوبارہ اندرونی تہہ خانے میں رکھ دیا تھا۔ ویسے اس دوران اس نے متعدد بار اس بات کی کوشش کی تھی کہ وہ کسی طرح سیف کھولنے میں کامیاب ہو جائے لیکن اسے ناکامی ہوئی تھی۔

پیر کے روز مسنر چارلس واپس آگئی۔ وہ بہت پریشان اور حواس باختہ نظر آرہی تھی۔ اس نے آتے ہی ہمیں ”بلیک میلرز“ کی کہانی سنائی شروع کر دی۔ مائیکل نے اس کی باتیں بڑی

توجہ سے سنیں۔ اور اپنے چہرے سے پریشانی کا اظہار بھی کیا۔ میں بھی چپ ادم بخود بیٹھا ہوا ہوں، چ رہا تھا کہ دیکھیں اب یہ اوٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

مسنر چارلس ساری کہانی سنا چکی تو مائیکل نے پر تشویش لہجے میں کہا: ”پھر اب کیا ہونا چاہیئے؟“

میں ہر قیمت پر اپنی گریٹا کو حاصل کرنا چاہتی ہوں، مائیکل!۔۔۔۔۔ ہر قیمت پر۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔ میری گریٹا۔ میں اس کے لیے دس ہزار ڈالر ضرور پیش کروں گی۔

”یعنی آپ پولیس کو اطلاع نہیں دینا چاہتیں؟“ ”ہرگز نہیں مائیکل! وہ میری گریٹا کو مار دے گا۔ میں یہ خطرہ نہیں مولے سکتی۔ اس نے آج ہی کا وقت دیا ہے میرا مطلب ہے بلیک میلرز نے۔ وہ جوانوں کے پارک میں ملے گا۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ ٹھہرو۔۔۔۔۔ پہلے میں رقم تولے لوں۔ تہہ خانے میں چلنا ہو گا ہاں، مائیکل یہاں ایک تہہ خانہ ہے۔ وہیں سیف میں رقم موجود ہے۔ آؤ!“

وہ دروازے کی طرف مڑی۔ مائیکل نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر آنکھ ماری۔ وہ اپنی کامیابی کے خیال سے بے حد مسرور تھا۔

ہم دونوں مسنر چارلس کے تہہ خانے میں پہنچے مسنر چارلس کے انداز سے بڑی عجلت ظاہر ہو رہی تھی اور مجھے نہ جانے کیوں اس بوڑھی عورت پر بڑا ترس آ رہا تھا۔ بیچاری کچنوس عورت! اسے واقعی اپنی گریٹا سے بڑی محبت تھی ورنہ وہ دس ہزار ڈالر کی رقم تو مگر کبھی خرچ نہیں کرتی۔

میں اور مائیکل مسنر چارلس کے دائیں بائیں تھے۔ اس نے سیف کھولا اور پھر ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میں اور مائیکل بوکھلائے ہوئے انداز میں سیف پر جھک گئے۔ جس میں ایک بلی کی لاش اکڑی ہوئی پڑی تھی۔

”گریٹا! مسنر چارلس ایک بار پھر چیخی اور اس نے بے تحاشہ جھک کر بلی کی لاش کو سیف میں سے نکال لیا۔ وہ اسے سینے میں لگائے پھوٹ پھوٹ رو رہی تھی۔

حقیقت کا اندازہ لگا لینا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ یہ کتنا حیرت انگیز اتفاق ہے کہ سیف کھولنے کے لیے مائیکل نے پولیس سے جو بہانہ کیا تھا وہی حقیقت بھی تھی۔ کسی وقت مسنر چارلس کی نادانستگی میں اس کی پیاری بلی حادثاتی طور پر سیف میں بند ہو گئی تھی اور اس کا دم گھٹ گیا تھا۔

وہ بلی جو ہمارے اخراجات پر باسیٹل میں: صاحب فراموش تھی۔ دراصل مسٹر چارلس کی کسی پڑوسی کی تھی۔  
ٹائیکل بھی یہ سب کچھ سمجھ چکا تھا اور اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی۔ اس کا سارا پلان تباہ ہو چکا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے اس ناکامی سے ذرا بھی تکلیف نہیں پہنچی تھی۔ اس کے

## عارضی مدیر شاہ محمد الحق قادری

انہیں دنوں میرا تعارف ایک صاحب سے ہوا جو زراعتی رسالے کے ایڈیٹر تھے۔ یہ رسالہ کاشتکاروں کی ایک انجمن نکالتی تھی۔ تعارف ضرورت سے کچھ زیادہ شاندار الفاظ میں ہو گیا اور ایڈیٹر صاحب مجھ سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ کئی سال سے حج پر جانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ اتفاق سے اس بار قمر میں ان کا نام بھی نکل آیا۔ انہوں نے کئی مہینے کے سفر کا پروگرام بتایا اور چھٹی کی درخواست کے ساتھ انجمن کے اکابرین سے میرے لیے سفارش کی۔ ان کی سفارش مان لی گئی اور میں عارضی مدیر بن گیا۔

رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے میں نے دن رات ایک کر دیے۔ مجھے دوسروں پر اعتماد نہ تھا۔ لہذا زیادہ تر مضامین میں نے خود لکھے۔ ٹائیکل پر ایک پہاڑ، دریا اور لہلہاتے ہوئے پودے بنواتے اور موٹے حروف سے علامہ محمد اقبال کا یہ بند لکھوایا۔

موسم اچھا، پانی وافر، مٹی بھی زرخیز!

جس نے اپنا کھیت نہ سنبھالا وہ کیسا ہتھکا

”عرض مدیر“ عنوان سے ادائیگے کی ابتدا اس شعر سے ہوئی

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج

اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیلو کی

اس مضمون میں پرچے کی ادارت میں تبدیلی، کچھ بھاری بھر کم وعدے اور مستقبل کے لیے خوش آئندہ اعلانات تھے۔ ادائیگے کا خاتمہ اس شعر پر ہوا۔

خزاں کے دن گذر گئے بہار کی ہو چلی

نکھر گیا شجر شجر سنور گئی کلی!

اس کے بعد باغبانی اور زراعت پر ایک طویل فنی مضمون تھا جو سینکڑوں افراد سے گفتگو کرنے کے بعد میں نے لکھا تھا۔

خدا جانے وہ زمانہ کب آئے گا جب ملازمین ڈگریوں پر نہیں بلکہ صلاحیتوں کی بنیاد پر ملیں گی۔ مجھ ہی کو دیکھیے۔ میری معلومات اتنی وسیع اور صلاحیتیں اس قدر گونا گوں ہیں لیکن افسوس سے ڈبویا مجھ کو بس ڈگری نہ ہونے نے  
میں ابھی ساتویں درجے میں تھا کہ خدمتِ خلق کی خاطر تصنیف و تالیف کے دھندے میں لگ گیا اور ایک سال کے عرصے میں کوئی ڈیڑھ سو مراسلے اور چالیس پچاس افسانے، مضامین، غزلیں اور نظمیں وغیرہ مختلف رسالوں کو بھیج دیں۔ میں یہ تو نہیں مان سکتا کہ وہ ساری چیزیں ناقابل اشاعت تھیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ بے چارے ایڈیٹروں کا محدود علم میرے بلند معیار تک نہ پہنچ سکا۔ ہر حال ان تمام چیزوں میں صرف دو مراسلے چھپے جن میں گزشتہ شمارے کی تعریف اور جریدہ زیر بحث کو بلا دلیل برصغیر کا سب سے عمدہ پرچہ بتایا گیا تھا۔

مصنف بننے کی چاٹ ایسی لگی کہ پھر بھول کر سکول کا خیال نہ آیا اور پڑھنے اور مسلسل تحریروں کے ذریعے شہر کے ادیبوں میں ایک مقام پیدا کر لیا۔ یقین کیجیے اس شہرت میں چائے کی ان پیالیوں کا قطعاً دخل نہ تھا جو میری جانب سے شہر کے ادیبوں کو اکثر دہشتِ پیش کی جاتی تھیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ اس صلاحیت کے باوجود ملازمت کے لیے مجھے ہمیشہ پریشان ہونا پڑا۔ میں نے ایک پریس میں پروف ریڈری کی۔ ایک روز نامے کے لیے کمیشن پر اشتہارات حاصل کیے ایک اخبار میں کچھ دنوں نیوز رپورٹر بھی رہا اور قدیم ادب کی تحقیق کا چسکا تو ایسا پڑا کہ پرانے رسالوں کی مدد سے کئی افسانے سفید اور غزلیں وغیرہ لکھیں۔ بہت سی شائع بھی ہوئیں۔ زندہ باد گنام مصنفین۔



اس میں معمولی معمولی باتوں کی جزئیات بھی درج تھیں اور آخر میں یہ شعر لکھ کر میں نے قارئین کرام پر اپنا احسان جتا دیا تھا ۔  
ہمارا خون بھی شامل ہے تڑپیں گلستاں میں  
ہمیں بھی یاد کر لینا چمن میں جب بہار آئے

رسالے میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے مناسب جگہوں پر میں نے پھول پودوں سے متعلق پھڑکتے ہوئے اشعار اور "اقوالِ انش" کے عنوان سے چند فقرے درج کر دئیے تھے۔ میرے ایک ادیب دوست کا فقرہ بطور شاہکار درج تھا۔ "بیسویں صدی میں انگنم از گندم جو ز جو، قدامت پرستی کی نشانی ہے۔ اب تو جو لوگ جو بوتے ہیں وہی گہیوں کاٹتے ہیں اور کانٹے ان کا مقدر ہیں جو پھول بوتے ہیں" اشعار کچھ اس قسم کے تھے ۔

یارب نگاہ بد سے چمن کو بچاؤ

بلبل بہت ہے دیکھ کر پھولوں کو بلبل باغ

غرض اس آب و تاب سے رسالہ چھپ گیا۔ شام تک جلدی بلدی گا بھوں اور ایجنٹوں کو پرچے بھجو کر میں گھر آ گیا۔ بستر پر لیٹ کر میں شاندار مستقبل کے منصوبے بنانے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ میری شاندار کامیابی کو دیکھ کر انجمن کے اراکین مستقل مدیر کو مستقل چھٹی دے دیں گے۔ وہ کتنے عرصے سے اس پرچے کی ادارت کر رہے تھے لیکن میری پہلی کوشش ان سے سیلوں آگے تھی۔ ان کے مرتب کیے ہوئے رسالوں میں گھسی پٹی اور خشک باتیں سپاٹ انداز میں ہر بار بیان کر دی جاتی تھیں لیکن میں نے جدت پیدا کر دی تھی۔

دوسرے دن دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ بچے ہوئے پرچوں میں سے صبح ہی صبح سا کھڑے پرچے نقد قیمت پر فروخت ہو گئے تھے۔ میں نے دل میں کہا: ابھی تو تمہید بہار ہے، بہار آنے دیجیے بھر دیکھیے زمین چمن کیسے کیسے گل کھلاتی ہے؟

اجانک ایک صاحب کوئی ستر برس کی عمر، سفید داڑھی صاف ستھرے کپڑے پہنے اور بگڑی باندھے ہوئے تشریف لائے۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ کوئی مہتمم اور تعلیم یافتہ کاشتکار ہیں اور رسالے کے ذریعے صحیح راہنمائی کرنے پر میرا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں۔ پھر میں نے فوراً کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا اور انھیں کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ انھوں نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔ "آپ نے اس سے پہلے بھی کسی پرچے کی ادارت کی ہے؟" میں نے کہا: "جی نہیں، لیکن صحافت سے میرا تعلق بہت پرانا ہے"

بڑے میاں بولے "میں صحافت سے آپ کے تعلق کی مدت نہیں پوچھ رہا ہوں۔ مجھے اس تعلق کی نوعیت سے کوئی دلچسپی تھی اور وہ معلوم ہو گئی۔ اچھا زراعت سے بھی آپ کا کوئی تعلق رہا ہے؟"

"میں نے بے لفظوں میں کہا: جی نہیں، لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے:۔۔۔"

میری بات کاٹ کر بڑے میاں بولے "آپ کے لیے تو کسی بھی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن میرے دل سے پوچھے رات بھر میں سو نہیں سکا۔ میں اس انجمن کے بانیوں میں سے ہوں آپ نے انجمن کی عزت خاک میں ملا دی۔ میں پرچہ دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ کو نہ صحافت کا تجربہ ہے نہ زراعت کا۔ سینے میں اس پرچے کا ایک جملہ آپ کو سناتا ہوں:۔

"درختوں کو ہلا کر شلجم توڑنے کا طریقہ فرسودہ

اور نقصان دہ ہے۔ اس سے شلجم خراب ہو جاتے ہیں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ کسی لڑکے کو درخت پر چڑھا متکیے وہ پکے پکے شلجم توڑ کر نیچے کسی چادر میں پھینکتا جائے" میں نے تعریف بولنے والے انداز میں بڑے میاں کی طرف دیکھا اور کہا: "دیکھیے گستاخی محاف، آپ تو جہانزیدہ اور تجربہ کار بزرگ ہیں۔ آپ کے لیے تو یہ بات بڑی معمولی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ہزاروں من شلجم صرف اس لیے برباد ہو جاتے ہیں کہ انھیں درختوں سے ہلا کر گرایا جاتا ہے"

بڑے میاں بھر کر بولے "الحق آدمی! تم نے شلجم کو درخت پر پھیلنے کب اور کہاں دیکھا؟"

یہ میرے لیے چونکا دینے والی بات تھی لیکن داد دیجیے میرے ذہن رساکی۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا: او ہو، میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ آپ کو درخت کے لفظ پر اعتراض ہے لیکن یہ تو میں نے استعاراً استعمال کیا تھا۔ درخت سے میری مراد بیل سے ہے۔ دراصل میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ شلجم کو توڑنے کے لیے اس کی بیل کو نہیں ہلانا چاہیے"

بڑے میاں سہج کر بولے "شلجم درخت پر بیل کے ساتھ نہیں لگتے بلکہ زمین کے اندر پیدا ہوتے ہیں"

بڑے میاں کاٹ کھانے والے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے باہر نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی میں سرکڑ کر بیٹھ گیا۔ آخر ایسی کون سی قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ آخر میری ایک بات سہواً غلط

بھی ہو گئی تھی تو باقی باتوں پر پانی کیسے پھر گیا؟ اتنے میں ایک اور دھماکا ہوا۔ ایک وحشت زدہ پہلوان مناسٹھ شخص میرا پرچہ لہراتا ہوا اندر داخل ہوا گھبرائے گھبرائے لمحے میں کہنے لگا۔ ”اسے پڑھیے جلدی سے پڑھیے۔ خدا کا شکر ہے مجھے ایک ساتھی تو مل گیا“ نہیں نہیں پورا صفحہ نہیں صرف دوسرا پیراگراف پڑھ دیجیے“ اس شخص کے تن و توش کو دیکھ کر میں گھبرا گیا اور جلدی جلدی پڑھنے لگا۔

”آلو بڑی ثقیل اور زود ہضم ترکاری ہے۔ اس کا پودا گو بھی کے پودے سے ذرا بڑا اور مٹاڑ کے پودے سے تھوڑا چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کی پتی اعلیٰ کی طرح لمبی اور کانٹے دار ہوتی ہے۔ اس کی اعلیٰ قسم شفا لو کھلاتی ہے، مگر شفا لو کو کیچوڑے سے بچانا بہت ضروری ہے۔ ابھی حال ہی میں آلو کی ایک نئی قسم بخارا سے لائی گئی ہے جسے آلو بخارا کہتے ہیں، لیکن ہمارے ملک میں ابھی اس کا تجربہ زیادہ کامیاب نہیں رہا“

نوجوان نے جلدی جلدی چند ورق اٹتے ہوئے کہا۔ اب اسے پڑھیے میں نے فوراً پڑھنا شروع کیا۔

”کیچوڑا چوبے کی قسم کا ایک جانور ہوتا ہے جس درخت پر لگ جائے اسے کھلے بغیر نہیں لہتا عموماً اپنے کام سے کام رکھتا ہے لیکن اگر کوئی چھیرے تو یہ کاٹ بھی لیتا ہے۔ ہمارے کاتب صاحب کا کہنا ہے کہ کیچوڑے کا بہترین علاج کچھوڑا ہے۔ دو کچھوڑے ایک ایک کھیت کے

تمام کیچوڑوں کو کھا جائیں گے۔ پھر کچھوڑے کو مار کر اس کی بیٹھ کی ڈھال بنا لیجیے۔ بہر حال بات اب تک تجربے میں نہیں آئی۔ قارئین کرام میں اگر کوئی صاحب تجربہ کریں تو ہمیں بھی مطلع کریں۔ ان کے نام اور شکریے کے ساتھ دوسروں کے فائدے کے لیے خبر چھاپ دی جائے گی“

نوجوان نے پرچہ میرے ہاتھ سے لیا اور جلدی جلدی مجھ سے ہاتھ ملانے لگا۔ تنگورسی دیر کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔ ”خدا کا شکر ہے آپ کی ذات میں مجھے ایک ساتھی مل گیا۔ میں زراعتی کالج کا ایک طالب تھا۔ تین برس پہلے مجھے بخارا آیا اور میں نے بھی اسی قسم کی معلوماتی باتیں شروع کر دیں، لیکن اس

شہر کے لوگ مجھے پاگل کہنے لگ گئے۔ میں آج کل اس بات کی تحقیق کر رہا ہوں کہ بھینس کی زبان سے گاؤ زبان کا کام کیوں نہیں لیا جاتا یا جب اردی اور ترٹی دونوں ہی کے پودے گیہوں کے پودے کی طرح موٹے موٹے ہوتے ہیں تو پھر اردی گول اور ترٹی چپٹی کیوں ہوتی ہے۔ بس بس اب مجھے سکون ہو گیا۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ آپ کو تکلیف تو ہوگی۔ ذرا یہ جملہ بھی پڑھ لیجیے“ میں انکار نہ کر سکا اور خود ذرا لے لے لگا۔ لکھا تھا۔

”چاول کے کھیت میں زیادہ پانی دینے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس سے چاول کے درخت جل جاتے ہیں“

وہ پاگل زور سے ہنسنا اور بولا ”ماشا اللہ کیا بات کہی ہے چاول کے کھیت، چاول کا درخت۔ یہی بات میں کہتا ہوں تو لوگ مجھے پاگل کہتے ہیں۔ میرے گھر پر ایک چیز ہے میں اسے دودھ کا کھیت کہتا ہوں تو لوگ کہتے ہیں اسے بھینس کو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے بھینس کیوں کہوں۔ بھینس تو بڑا غیر شاعرانہ لفظ ہے۔ شروع ہی بھینس سے ہوتا ہے۔ دودھ کا کھیت کس قدر رومانیت ہے اس لفظ میں۔ اگر چاندنی کا کھیت ہو سکتا ہے تو دودھ کا کھیت کیوں نہیں ہو سکتا؟ صاحب سچی بات تو یہ ہے کہ میرے اور آپ کے مزاج میں بڑی یکساہت ہے۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بہت مدد ملے گی، بلکہ میں آج ہی دو تین مضامین آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ اگر یہ مضامین چھپ گئے تو انشا اللہ زراعت کی دنیا میں ایک انقلاب آ جائے گا یہ وہ بولتا رہا اور میں ایک عجیب کرب کے عالم میں اس کی باتیں سن رہا تھا۔ خدا کا شکر کہ وہ جلد ہی اٹھ گیا اور یہ کہتا ہوا چلا گیا۔ بس میں ابھی جا کر اپنے مضامین آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔ میرا پہلا مضمون کیلے اور کریلے کے باہمی تعلق پر ہوگا۔ اگر کیلے کی بیل کریلے کی طرح نیم پر پڑھ جلتے تو کیا کیلا بھی کڑوا اور مزیدار ہو جائے گا یا حسب سابق پھیکا اور بدمزہ ہی رہے گا؟

ابھی یہ پاگل باہر گیا ہی تھا کہ انجن کے دو تین اراکین کے ساتھ مدیر رسالہ بلانے ناگمانی کی طرح نازل ہوئے اور میری طرف خوشخوار نظروں سے دیکھنے لگے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ شام ہی کو ٹرنک کال کر کے انجن کے اراکین نے انھیں بلایا تھا۔ وہ بول رہے تھے اور ان کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ انھوں نے تڑپتے ہوتے کہا ”ہائے ہائے تم نے میری ساری عزت

پر پانی پھیر دیا۔ بد بخت انسان! تم نے مجھ سے پہلے کیوں نہ کہہ دیا کہ زراعت میں تمہارا علم ایک نیچے سے بھی گیا گزرا ہے۔ اگر تمہیں خود کچھ نہیں آتا تھا تو پچھلے برسوں سے کچھ مضامین نقل کیوں نہ کر دیے۔ کسی طرح بھرم تو باقی رہ جاتا، میرے بہت سے غیر مطبوعہ مضامین رکھے ہوئے تھے، تم نے انہیں کیوں نہ شائع کر دیدے۔

میں سمجھ گیا کہ محترم مدیر میری غیر معمولی کامیابی سے جل گئے ہیں اور وہ اپنے مستقبل کی خاطر جلد از جلد مجھے یہاں سے نکال دینا چاہتے ہیں۔ میں نے سوچا اس وقت دینا فضول ہے پہلا تاثر ہی آخری تاثر ہوتا ہے، لہذا انہیں نظر انداز کر کے میں انجن کے نائب صدر سے مخاطب ہوا۔ میں نے ان کے سامنے سارے حالات لکھ دیے اور انھیں یہ بھی بتا دیا کہ آج پہلے ہی دن سلٹھ سے

زائد کاپیاں فروخت ہوئی ہیں۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ اگر مجھے کچھ دن اور موقع ملا تو میں رسالے کی اشاعت کم از کم بیس ہزار کروں گا۔ پھر میں نے خوشامداند انداز میں ان سے کہا کہ ہمارا آئی نکالو مت مجھے اب کے گلستان سے مراد امن بندھے تو باندھ لو گل کے گریباں سے

یہ پھر کتنا ہوا شعر سن کر نائب صدر کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آگئی۔ میں سمجھا میرا کام بن گیا، لیکن ایڈیٹر صاحب تو بہت ہی بد ذوق واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی بد کلامی جاری رکھی اور کہنے لگے "کمبخت! تو نے میرا جج ضائع کر دیا۔ اب منہ کیا دیکھ رہا ہے پس فوراً باہر جا" میں نے سوچا کہ بے عزتی کے اس علوے سے عزت کی سوکھی روٹی بہتر ہے، لہذا میں چپ چاپ باہر نکل آیا۔

## جیمز نگدچی

## شہید

مجھے اس سرزمین کو اپنا گھر یا وطن نہ سمجھتے تھے۔ ان کا وطن یورپ تھا۔ مسز ہل لمبے چوڑے کھیتوں اور چائے کے باغات کی مالک تھیں اور اس علاقے کے لوگ اس کا احترام کرتے تھے۔

اس علاقے کے سفید فام مسز ہل کو "آزاد خیال" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ دل سے وہ مسز ہل کو پسند کرتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں مسز ہل "مقامی کالوں" کے ساتھ نرمی کا سلوک کر کے ان کے دلوں سے سفید فاموں کا رعب اور دبدبہ کم کر رہی تھیں۔ قتل کی اس واردات کو دو دن ہو چکے تھے کہ مسز سمائیلز اور مسز ہارڈی، مسز ہل سے ملاقات کرنے کے لیے آئیں۔ مسز سمائیلز اور مسز ہارڈی کے چہروں پر ایک اداس اور قدرے طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ یہ مسکراہٹ زبان حال سے کہہ رہی تھی "تم نے ان وحشی اور اجڈ کالوں کے ساتھ نرمی کا سلوک روا رکھ کر دیکھ لیا۔ یہ محسن کش ہیں، اگر انھیں ہم سفید فاموں کے احساسات کا رتی بھر بھی احساس ہوتا تو یہ مسٹر اور مسز گارسلٹون کو ہلاک نہ کرتے"۔

مسز سمائیلز ایک دہلی پتلی اور ادھیڑ عمر کی عورت تھیں۔ اس کے درشت خدو خال اور اوپر کوٹھی ہوئی ناک اور ہمیشہ کے بھنے ہوئے ہونٹ اس کی سخت طبیعت کا پتہ دیتے تھے۔ مسز سمائیلز کو یہ یقین راسخ تھا کہ کینیا کے مقامی کالے، وحشی اور خیر

گنہگار دہشت پسندوں نے مسٹر اور مسز گارسلٹون کو ان کے گھر ہلاک کر دیا۔ چاروں طرف کھلبلی مچ گئی۔ اخبارات کے پہلے صفحے پر قتل کی یہ خبر سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی۔ ریڈیو نیوز ریل میں اس قتل کی تفصیلات بتائی گئیں۔ قتل کی اس واردات کو شاید اس لیے زیادہ اہمیت دی گئی تھی کہ یہ پہلا سفید فام جوڑا تھا جو ملک گیر دہشت پسندی کا شکار ہوا تھا۔ سفید فام آباد کار تھراٹھے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس قتل کے پیچھے سیاسی اسباب کا فرما تھے۔ اصل اسباب کی طرف تو کسی نے توجہ نہ دی، لیکن یہ خبر مدتوں تک زبان زد عام رہی۔ جہاں جلیئے، اسی قتل کی واردات کا ذکر سنائی دیتا۔ منڈیوں، بازاروں اور گلی کوچوں میں لوگ اسی واقعہ پر گفتگو کرتے ہوئے دکھائی دیتے۔

اس علاقہ میں ایک پہاڑی پر ایک الگ تھلک مکان واقع تھا۔ یہ گھر مسز ہل کا تھا جس کا شوہر اس علاقے کے پرانے سفید فام آباد کاروں میں سے ایک تھا اور پچھلے برس طبریا سے اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔ مسز ہل کے دو بچے تھے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا، اور یہ دونوں بچے ان دنوں اپنے "وطن" یورپ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ برسرِ برس سے افریقہ میں آباد ہونے والے سفید فام اب

متمدن تھے۔ اگر ان میں تھوڑی بہت تہذیب آئی ہے یا سلیقہ پیدا ہوا ہے تو وہ سفید فاموں کی دین ہے، لیکن یہ کالے آنٹی سمیت ہڈی کے بنے ہوئے ہیں کہ مکمل طور پر مہذب بننے کے لیے انھیں صدیاں درکار ہیں۔

مسٹر ہارڈی کی اپنی کوئی رائے نہیں تھی۔ وہ اپنی نسل کی رائے کو ابھیں بند کر کے تسلیم کر چکی تھی کہ دنیا کی سب سے برتر قوم ہے تو سفید فام۔ اور کالے تو احسان فراموش، سدا کے نکمے، کام چور، انسانیت تو انھیں چھو کر بھی نہیں گزری، ان دونوں کے برعکس مسٹر ہل کا اپنا فلسفہ تھا: ”یہ کالے دل کے اچھے ہیں۔ یہیں چاہیے کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ یہ شفقت کے بھوکے ہیں۔“ مسٹر ہل بڑے فخر اور سکون سے کہا کرتی تھی: ”میرے لڑکوں کی طرف دیکھو! میرے اشرار پر جان دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ میں جو کہوں اس پر سو فیصد عمل کرتے ہیں۔“ ظاہر ہے مسٹر ہل جن کو اپنے لڑکے کہتی تھی وہ اس کے سیاہ فام ملازم تھے۔ مسٹر ہل نے اپنے ملازموں کے لیے اینٹوں کے کوارٹرز بنا رکھے تھے۔ ان کے بچوں کے لیے ایک اسکول بھی تعمیر کیا تھا، اب یہ دوسری بات ہے کہ اس اسکول میں صرف ایک ہی استانی تھی اور پڑھنے والے لاتعداد بچے سکول میں ایک دو گھنٹے کے لیے جاتے تھے، الف بے رٹنے اور پھر کھیتوں اور چائے کے باغات میں کام کرنے کے لیے چلے جاتے۔

اگر مقامی کالے مسٹر ہل کی عزت کرتے تھے تو اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے اپنے ملازموں کی رہائش کا بندوبست خود کیا تھا۔ جب کہ دوسرے آباد کار اپنے ملازموں کو ایسی کوئی رعایت دینا کالے لوگوں کو سر چڑھانے کے مترادف سمجھتے تھے۔

مسٹر سٹیلز نے کتنا شروع کیا ”ظلم، تشدد.... اوہ مائی گاڈ! ہم ان کے لیے تہذیب اور تمدن کی نعمتیں لے کر آئے ہیں۔ ہم نے غلامی کا خاتمہ کیا، قبیلوں میں صلح کرائی اور ہمیشہ کے جھگڑوں کو ختم کرایا۔ مگر یہ لوگ....؟ یہ کبھی انسان نہیں بن سکتے۔ انھوں نے ہمارے مہربانیوں کا خوب صلہ دیا ہے چلے مسٹر گارسلٹون اور اس کی بیوی کو کتنی بے رحمی سے ہلاک کیا گیا ہے۔ ان لوگوں میں انسانیت تو سرے سے موجود ہی نہیں۔“

”ہمیں تحمل سے کام لینا چاہیے“ مسٹر ہل نے کہا۔  
”تحمل تحمل، بردباری....“ آخر ہم کب تک تحمل سے کام لیتے رہیں گے؟ مسٹر سٹیلز نے چیخ کر کہا۔

”میں تو چاہتی ہوں کہ ان سب کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔“

مسٹر ہارڈی نے بھی منہ کھولا۔ آخر اسے بھی اپنی نسل کی برتری کا اظہار کرنا تھا۔

”ذرا سوچو تو ان کا قتل کیسے ہوا؟ اس وقت وہ آرام کر رہے تھے۔ شب خوابی کے کمرے میں تھے۔ ان کے اپنے ملازم نے انھیں جگایا،“ مسٹر سٹیلز نے کتنا شروع کیا۔  
”کیا واقعی؟“ مسٹر ہل نے پوچھا۔

”تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟“ مسٹر سٹیلز نے چڑھ کر کہا: ”ان کے اپنے ملازم نے دستک دے کر انھیں جگایا اور کہا کہ وہ جلدی سے دروازہ کھول دیں۔ بڑا اہم کام ہے۔“  
”ممکن ہے اس بے چارے ملازم کو دہشت پسندوں نے جان سے مارنے کی دھمکی دی ہو؟“ مسٹر ہل نے کہا۔

”نہیں یہ پہلے سے طے شدہ منصوبہ تھا۔ ایک حربہ تھا۔ جونہی انھوں نے دروازہ کھولا، وہ اندر داخل ہو گئے اور پھر انھیں بے رحمی اور سفاکی سے قتل کر دیا گیا۔ اوہ مائی گاڈ!“ مسٹر سٹیلز نے آہ بھر کر کہا۔

چائے کا وقت ہو چکا تھا۔ مسٹر ہل نے اپنے ملازم کو آواز دی: ”جو رگو! جو رگو!“

جو رگو مسٹر ہل کے گھر کے اندر کام کاج کرتا تھا۔ وہ لبے قد اور فراخ شانوں والا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ تقریباً دس برس سے وہ مسٹر ہل کے ہاں ملازم تھا۔ مسٹر ہل اس پر بے حد اعتماد کرتی تھی۔ اس وقت اس نے سبز رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی۔ کمر کے ارد گرد سرخ رنگ کا ٹیکا اور سر پر سرخ رنگ کی بلی کیپ۔

”حکم میم صاحب!“

”جو رگو چلے لاؤ!“

جو رگو نے اپنی میم صاحب کے پاس بیٹھی دوسری ”میم صالوں“ کو گہری نظر سے دیکھا اور چلے بنانے کے لیے چل دیا۔ اس کے جاتے ہی مسٹر ہارڈی نے کہا: ”دیکھتے ہیں یہ لوگ کتنے معصوم نظر آتے ہیں۔“

”ہاں، بالکل بھول کی طرح خوبصورت۔ لیکن ان کے اندر زہر ملا سا نیپ چھپا ہوا ہے۔“ مسٹر سٹیلز نے کہا۔

”دس برسوں سے میرے پاس ہے۔ ایک بار بھی اس نے میری نافرمانی نہیں کی!“ مسٹر ہل نے جو رگو کی مدافعت کرتے ہوئے کہا۔  
”مجھے اس کے چہرے کے پیچھے خباثت نظر آتی ہے۔“  
”مجھے بھی۔“ تابع مہل مسٹر ہارڈی نے تائید کی۔

جو رگو چائے لے آیا۔ وہ لوگ چلے پینے لگے۔ مسٹر اور

مسز گارڈن کے قتل، حکومت کی پالیسی اور کالوں کی بدفطرتی پر بات ہوتی رہی۔ جب مسز سائیکل اور مسز ہارڈی چلی گئیں تو مسز ہل نے سنجیدگی سے قتل کی اس واردات کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ پہلی بار اسے بڑی شدت سے احساس ہوا کہ وہ حوزت ہے اور اس کا گھر آبادی سے خالص فاصلے پر پہاڑی پر الگ تھلک ہے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو مدد بھی نہ ملے گی، لیکن ان خدشوں کو اس نے ذہن سے جھٹک دیا۔ اس احساس سے اسے بڑی تسکین حاصل ہو رہی تھی کہ ایک بھرا ہوا پستول ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے۔

رات کا کھانا ختم ہوا تو جو رگو کو بھی چھٹی مل گئی۔ وہ گھر کی روشنیوں سے نکل کر تاریک راستوں پر چلتا ہوا کوارٹرڈل کی طرف روانہ ہو گیا، جو مسز ہل کے گھر سے خالص فاصلے پر تھے۔ اپنی تنہائی اور تاریکی کے احساس کو کم کرنے کے لیے اس نے سیٹی بجنے کا کوشش کی مگر اس کا دل نہ چاہا۔ اس وقت کسی آواز کے چہنچہ کی آواز سنائی دی۔

وہ رک گیا۔ اس کے سامنے تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ پیچھے مدھم روشنیوں میں مسز ہل کا مکان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ غصیلی نظروں سے اس مکان کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اوہ تم... تم... میں کتنے عرصے سے تمہارا ملازم ہوں۔ تم نے مجھے تباہ کر کے دکھ دیا۔ میری اپنی زمین بھی آج میری نہیں ہے۔ میں نے اس گھر کی کتنی خدمت کی ہے۔ اور اس کے صلے میں مجھے کیا ملا؟“ وہ چیخنا چاہتا تھا مگر جانتا تھا کہ اس کے احتجاج کی صدا کا جواب گونگے اور نیم روشن مکان سے کبھی نہ ملے گا۔ وہ پھر چلنے لگا۔ آواز نے ایک بار پھر چیخ ماری۔

”یہ اس کے لیے انتباہ ہے“ جو رگو نے سوچا۔ اور ایک بار پھر اس کی روح غصے سے تھلا اٹھی۔ یہ غصہ ان سب کے لیے تھا جن کی چٹری سفید تھی۔ ان سب غیر ملکی آبادکاروں کے لیے جنہوں نے اس سرزمین کے اصلی بیٹوں سے ان کی زمین چھین لی تھی۔ ان کا سب کچھ ہتھیالیا تھا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے باپ کا چہرہ آگیا۔ طیش سے سرخ چہرہ۔ اس کے باپ نے اپنی عمر کے کئی برس ان سفید فام آبادکاروں کے قدم اکھاڑنے کی جدوجہد میں صرف کر دیے تھے اور پھر یہ واقعہ پیش آیا۔ جب پیرامن لوگوں کا جلوس نیروولی کے بازاروں سے گزر رہا تھا۔ یہ سب لوگ اپنے حقوق کے

لیے نعرے لگا رہے تھے کہ اس پیرامن جلوس پر گولی چلا دی گئی۔ مرنے والوں میں اس کا باپ بھی تھا۔ اپنے باپ کی موت کے بعد اس کو زندہ رہنے کے لیے کئی جگہ ملازمت کرنی پڑی۔ ان لوگوں کی ملازمت جو اس کے ملک کی ہر چیز پر قبضہ کر رہے تھے جن کی چٹری سفید تھی۔ کتنے ہی سفید فاموں کی بدسلوکی اور اہانت کے زخم سینے پر کھاتا ہوا وہ مسز ہل کے پاس پہنچا تھا۔ حالات اسے ایک ایسی جگہ پر لے آئے تھے جہاں شاید وہ اپنی مرضی سے کبھی نہ آتا۔ زمین کا ایک وسیع و عریض قطعہ جو آج مسز ہل کی ملکیت تھا، کبھی اس کے خاندان کی ملکیت تھا۔ اس کے باپ نے کئی بار اس کو زمین کا یہ قطعہ دکھا کر کہا تھا: ”اگر اس علاقے میں قحط نہ پڑتا تو آج بھی یہ اراضی ہماری ہوتی۔ بھوک سے بچنے کے لیے میں نے مدتوں دوڑ دھوپ کی، مگر میری کسی نے ایک نہ سنی۔ میرے بیٹے! یہ انجیر کا درخت دیکھتے ہو، یہاں سے ہماری زمین شروع ہوتی ہے۔ ہمیشہ یاد رکھنا! یہ زمین تمہاری ہے۔ ایک نہ ایک دن ان غیر ملکی سفید فاموں کو ہمارے ملک سے نکلنا ہو گا، تب تم اس پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کر دینا!“

یہ سب جو رگو کے لڑکپن کی یادیں تھیں۔ اب وہ ادھیڑ عمر کا ہو چکا تھا۔ جب سے وہ مسز ہل کے ہاں ملازم ہوا تھا، اس کے دل میں کانٹا سا کھٹکتا رہتا تھا۔ اس نے مسز ہل کو کبھی پسند نہ کیا تھا۔ اگر کبھی بھولے بھرے اس کے دل میں یہ خیال آجاتا کہ مسز ہل دوسرے سفید فاموں سے اچھی ہے تو وہ اپنے آپ کو ڈانٹنے لگتا۔ وہ مسز ہل کو منافق اور موقع پرست سمجھتا تھا۔ خیالوں کی دنیا سے نکل کر جو رگو اچانک چہنچہ لگا۔ میں ان سب سے نفرت کرتا ہوں، میں ان سب سے نفرت کرتا ہوں“ دل کی بھڑاس نکل جانے کے بعد وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ پھر اس نے اپنے آپ سے کہا۔

”آج رات مسز ہل قتل کر دی جائے گی ایک اور سفید فام آقا مر جائے گا۔ اسے بھی اپنے مظالم کی سزا بھگتنی پڑے گی۔“ اپنے ایک کمرے کے کوارٹر میں آکر اس نے لالٹین جلائی اور سگریٹ پینے لگا۔ اس پاس کے تمام کوارٹرڈل میں تاریکی تھی۔ اس کمرے میں اس کی دو بیویاں اور چار بچے بھی رہتے تھے۔ جو اس وقت باہر کہیں گھومنے پھرنے گئے ہوئے تھے جو رگو نے کہا: ”اس ایک کمرے میں ہم سات آدمی رہتے ہیں پھر بھی مسز ہل سمجھتی ہے کہ اس نے ہمیں یہ کوارٹر دے کر بڑا احسان کیا ہے“ وہ مسکرا دیا۔ وہ تصور میں مسز ہل کو ہلاک ہوتے دیکھ رہا

تھا۔ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہی تھی۔ آج رات وہ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ چکانا چاہتا تھا۔ منصوبہ ہر طرح سے مکمل تھا۔ دوسرے "آزادی پسند" آنے ہی والے تھے۔ وہ انہیں اپنے ساتھ مسز ہل کے ہال لے جلتے گا اور پھر —

ایک بار پھر اسے آلو کی دلخراش آواز سنائی دی۔ جو رگڑنے کہا "آلو کی آواز بدشگونی کی علامت ہوتی ہے" پھر اس نے اپنے آپ سے کہا "مگر یہ بدشگونی میرے لیے نہیں، مسز ہل کے لیے ہے۔۔۔۔۔" اس کی آنکھوں کے سامنے مسز ہل کی شکل آگئی۔ پچھلے دس برسوں سے وہ اس کا ملازم تھا۔ ایک برس پہلے مسز ہل کا شوہر مرا تھا۔ جو رگڑ جاتا تھا کہ مسز ہل کو اپنے شوہر سے بے پناہ محبت تھی۔ جب وہ مرا تھا تو اس کی موت کے صدمے سے خود مسز ہل موت کی دلیتر تک پہنچ گئی تھی۔ اچانک جو رگڑ کے دل میں مسز ہل کے لیے رحم کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے مسز ہل کے بچے آگئے۔ لڑکی اور لڑکا جو اس کے سامنے جوان ہوئے تھے۔ دونوں بچے اپنی ماں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ مسز ہل بھی اپنے بچوں پر جان دیتی تھی۔ اس کے دل سے ابک ہو کر نکلی۔ یہ دونوں اب، ماں سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ ان کے سروں سے باپ کا سایہ تو اٹھ ہی چکا تھا اب ماں بھی.....

اچانک جو رگڑ کو احساس ہوا کہ وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے اس پر عمل کر سکے گا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اب جس مسز ہل کی تصویر تھی، وہ سفید فام ماکن نہ تھی جو اس کی زمین پر قابض تھی، بلکہ وہ صرف ایک عورت تھی۔ ایک بیوہ، ایک ماں۔ اسے اپنی ماں یاد آگئی۔ جو رگڑ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے "نہیں،... وہ ایک ماں کو قتل نہیں کر سکتا" جو رگڑ نے اپنے خیالات کا رخ موڑنا چاہا۔ مگر اس کی اپنی ماں اور مسز ہل کی صورتیں اس کی آنکھوں کے سامنے گڈ مڈ ہو جاتی تھیں۔ نہیں، وہ ایک عورت، ایک ماں، ایک بیوہ کو قتل نہیں کر سکتا۔ وہ صرف سفید فام آباد کاروں اور مالکوں کی جان کا دشمن تھا، ان سے نفرت کرتا تھا مگر ایک ماں سے نہیں۔ اس کی شخصیت دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ اس کے اندر کا انسان بیدار ہو گیا تھا۔

"اب میں کیا کروں؟ کیا اپنے آزادی پسند ساتھیوں سے غداری کروں۔ وہ تو اب آنے ہی والے ہوں گے۔ میں انہیں کیا کہوں گا؟ کیا وہ میری بات مان لیں گے؟"

تیزی سے وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ چاروں طرف تاریکی تھی۔ کچھ ستارے بھی جیسے جو رگڑ کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نے آسمان پر ایک نظر ڈالی۔ پھر تیز تیز چلنے لگا۔ اس کی منزل مسز ہل کا گھر تھا۔ اس نے مسز ہل کو بچانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یوں، میں اس کے بعد یہاں سے چلا جاؤں گا۔ دُور۔ دُور جنگلوں میں۔ میرا ضمیر مطمئن رہے گا۔ میرے آزادی پسند ساتھی بھی مجھے بھول جائیں گے۔ وہ بھاگنے لگا۔ وہ اپنے اندر انسانیت کا چراغ بجھتے نہ دیکھ سکتا تھا۔ پسینے سے بھیکا ہوا، سانس پھولا ہوا، وہ مسز ہل کے دروازے پر پہنچا۔ وہ چیخنے لگا، میم صاب۔ میم صاب! ساتھ ہی ساتھ وہ زور زور سے دروازہ بھی کھٹکھٹاتا رہا تھا۔

مسز ہل ابھی سونے کے کمرے میں نہ گئی تھی۔ ابھی تک وہ خیالوں میں گم تھی۔ جو رگڑ کے جانے کے بعد وہ گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔ وہ بے حد مضطرب تھی۔ اس نے سیتول اپنے سامنے رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنے مرے ہوئے خاوند کو یاد کر کے اپنے آپ کو بے بس اور اکیلی محسوس کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر ان لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جلتے تو یہ کبھی کسی کی جان دلیں، لیکن اب دہشت اور قتل و غارت گری کی لہر پھیل رہی تھی۔ مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ نیروبی یا کنسان گاپ خواہ چند دنوں کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔ کم از کم میں اپنے دوستوں کے پاس تو رہ سکوں گی۔ پھر اس کے دل میں اپنے ملازموں کا خیال آیا۔ ان کا کیا کروں؟ کیا انہیں یہاں چھوڑ جاؤں؟ اور گھریلو ملازم جو رگڑ کو کتنا وفادار ہے۔ مگر اس کی دو بیویاں اور چار بچے ہیں۔ کیا وہ انہیں چھوڑ کر میرے ساتھ چلا جلتے گا۔ کیا میں ان کے سارے کنبے کو اپنے ساتھ لے جاؤں؟ نہیں یہ تو شاید ممکن نہیں! وہ ایسے ہی متفاد خیالوں میں گھری ہوئی تھی کہ اسے دستک کی تیز آواز سنائی دی۔ کوئی پکار رہا تھا "میم صاب، میم صاب! اوہ! اس نے سوچا! یہ تو جو رگڑ کی آواز ہے!"

کسی انجانے خوف سے اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ اس کا ذہن گھوم گیا۔ گارسلٹون کنبے کو ان کے ذاتی ملازم نے کس طرح ماریا تھا؟ مسز سائیلز کی باتیں اس کے ذہن میں گونجنے لگیں۔ جو رگڑ جو کچھ کہ رہا تھا، اسے وہ سن ہی نہ رہی تھی۔ وہ لرز رہی تھی "اچھا تو جو رگڑ قاتلوں اور دہشت پسندوں کو یہاں لے آیا...."

اچانک ایک لمحے میں اس کے اندر ہمت پیدا ہو گئی۔ وہ جاتی تھی کہ وہ اکیلی ہے۔ جو رگڑ اور اس کے ساتھی دروازہ توڑ کر بھی اندر

”سکتے ہیں۔ نہیں“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”میں عزت کی موت مروں گی“ پستول کو مقبوضی سے ہاتھوں میں تھامے وہ اٹھی اور دروازہ کھولتے ہی گولی چلا دی۔ پھر اس کا سر ٹکرا گیا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کسی انسان کو ہلاک کیا تھا۔ اب وہ ایک کمزور اور بے آسرا عورت تھی۔ وہ زمین پر گر پڑی۔ پیچھے لگی آؤ اور مجھے قتل کر دو....“

جورگو مر چکا تھا۔

دوسرے دن جورگو کی موت کی خبر سارے اخباروں نے

شائع کی تھی۔ مسز ہل کی شجاعت اور بہادری کے کارنامے، کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا کہ اس اکیلی عورت نے نہ صرف درجنوں دہشت پسندوں کا بہادری سے مقابلہ کیا بلکہ ایک خداداد ملازم اور ظالم حملہ آور کو بھی ہلاک کر دیا۔

مسز ہارڈی اور مسز سائیلز اسے مبارکباد دینے آئیں مسز سائیلز نے فاتحانہ لہجے میں کہا: ”اب تو تمہیں یقین ہو گیا کہ یہ کالے کتنے ظالم اور اہل ہیں۔ انسانیت تو ان کے قریب سے بھی نہیں گزری!“

## حرف بہ حرف

## دقت سنگھ

اچھا خاصا خرچ اس کا بھی تھا۔ نتیجتاً رام لہجائے پر کچھ نہ کچھ قرض ہمیشہ چڑھتا رہتا تھا۔ انھی محرومیوں کے باعث وہ نجومیوں، جو تھیوں اور پامسٹوں کو ہاتھ دکھانے کا عادی ہو گیا تھا۔ کوئی فقیر ماتھے پر تلک لگائے آجاتا تو فوراً اسے ہاتھ دکھانے لگتا، ”دیکھیے بابا! میری قسمت میں کوئی پیسہ وسیع بھی ہے یا نہیں؟“ اس کی عمر جیسے جیسے بڑھتی جا رہی تھی، اس کی دلی ہوئی خواہشیں تیزی سے ابھرنے لگی تھیں اور جیسے جیسے خواہشوں نے ابھرنے شروع کیا تھا۔ ویسے دیے وہ جو تھیوں کے پاس زیادہ جانے لگا تھا۔ جب بھی اُسے برتہ چلا کہ شہر میں کوئی اچھلا بندرت یا جو تھی آیا ہے، وہ گھر سے ضروری اخراجات تک بالائے طاق رکھ کر اس کی فیس کا بند و بست کرتا اور اپنی قسمت جاننے کے لیے پہنچ جاتا۔ اس مہینے گیسوں لانے کے لیے اُس نے پندرہ روپے بچا کر رکھے تھے مگر دفتر میں اس کے ساتھی کلرک نے اسے بتایا کہ شہر میں ایک جو تھی آیا ہوا ہے جو بالکل سچی باتیں بتاتا ہے۔ اس نے گیسوں صرف دس روپے کے لیے اور پانچ روپے بچا کر جو تھی جی کے ہاں، جا پہنچا۔ دراصل وہ بھی جانتا چاہتا تھا کہ اسے کبھی دولت بھی ملے گی یا وہ ہمیشہ کلرک کی ہی کرتا رہے گا، مگر جو تھی جی نے اُسے جو بات بتائی وہ بات بہت خوف ناک تھی۔

وہ مجھے ہوئے دل سے وہاں سے اٹھا، جو تھی جی کو پرنام کیا اور چل پڑا۔ ابھی اس نے دو ہی قدم اٹھائے تھے کہ کسی چیز سے اس کا پیٹ ٹکرایا اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔

”اے میاں سنبھلنا،“ ایک آدمی نے اُسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

”میں چشمہ لانا بھول گیا تھا۔ عینک کے بغیر صحیح طرح نظر نہیں آتا“

”جیل بڑا رام لہجائے نے اپنی جنم کنڈلی کی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوئے بول چھایا: ”کیا کہا جو تھی جی آپ نے جیل جانا ہوگا؟“

”ہاں بھائی! جیل جانا ہوگا“ جو تھی جی نے ہکاری بھری آواز میں جواب دیا۔

دراصل مجھے یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ لیکن غلطی سے منہ سے نکل گئی۔ اب دیکھو نا تم ایک میگھ راشی ہو۔ جنم پتری کے مطابق چندرا ماہ دوں کا ہے، رام پانچویں گھر میں ہے اور چلت کنڈلی میں سپر پانچویں گھر میں بیٹھا ہے اور یہ بات بڑی نقصان دہ ہے، اس کا مطلب ہے راج کاج میں ہار، کاروبار میں نقصان اور جیل ہونا ہے“

”مگر جو تھی جی!“ رام لہجائے کا پسینہ چھوٹ نکلا۔ ”میرا تو کسی سے کوئی جھگڑا و گڑا بھی نہیں ہے۔ ایسا آخر کیوں ہونے لگا؟“

”میں کیا جانوں؟“ جو تھی جی نے آنکھیں نکال کر کہا: ”جنم کنڈلی یہی بولتی ہے۔ جیل جانا ہوگا“ رام لہجائے کا دل الٹنے لگا۔ گھبرا کر بولا: ”مگر جو تھی جی یہ جیل کتنے دن کے لیے ہوگی؟ کب ہوگی؟ یہ تو بتا دو“

جو تھی جی دوبارہ کنڈلی پر ٹھیک گئے: ”یہ بھادول چل رہا ہے، مہینے بعد چند ماہ دوں کا ہوگا“ وہ منہ ہی منہ حساب کر کے بولے: ”میرا حساب تو کہتا ہے کہ بھادول، اسوج اور کاتک تم پر بھاری ہیں، آگے کوئی خطرہ نہیں ہے“

رام لہجائے دو سو روپے ماہوار پر ایک دفتر میں کلرک کرتا تھا، صرف چالیس سال کی عمر میں اس کا رنگ زرد ہو چکا تھا۔ پانچ پختے تھے۔ اتنی تنگی سے گزر رہی تھی کہ اس نے برسوں سے کوئی فلم تک نہیں دیکھی تھی، کوئی تفریح بھی نہیں کرتا تھا۔ یہاں تک کہ دفتر میں بھی بھوکا رہتا تھا اور شام کو گھر آ کر کھانا کھانا تھا۔ بیوی بچوں کے علاوہ ایک چھوٹا بھائی بھی تھا۔ جسے وہ دوسرے شہر بھیج کر بڑھا رہا تھا۔



کے قطرے چمک رہے تھے۔ آپ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ کیا دفتر میں آج کام زیادہ تھا؟

”نہیں۔ میری طبیعت خراب ہے۔ میں کھانا نہیں کھا سکوں گا۔“ اس نے جواب دیا۔ وہ جوتشی کی بات بیوی کو بتانا نہیں چاہتا تھا۔ بیوی نے اس کی بات سن کر اس کا بازو چھوا اور بولی: ”کچھ نہیں تھکن ہے۔ خیر میں چائے بنا لیتی ہوں۔“ رات کو جب رام لیٹا تو اس کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ اس نے سر کو پر اکثر مجرموں کو دیکھا تھا جنہیں پولیس والے لے جا رہے ہوتے تھے۔ اُن میں سے بعض تو بے حد اگڑتے ہوئے چلتے تھے اور بعض بعض اپنا منہ ڈھانپ کر بھی چلتے تھے، اس نے سوچا، اگر میں پکڑا گیا تو کیا کروں گا؟ حوالات، جیل، کچہری، پھر لے دار، ہتھکڑیاں، سزا کا حکم اخبار میں خبر، سوچتے سوچتے اس کا دماغ دکھنے لگا۔ اس نے سچی رکھا تھا کہ مصیبت آنے سے پہلے اس کے دھنسنے کے لیے کوئی علاج کر لیا جائے تو مصیبت طل جاتی ہے۔ وہ اب محتاط رہنا چاہتا تھا۔ وہ ہر طرح محتاط رہے گا۔

اس نے صبح سب سے پہلے اپنے بچے کلش کو بلا کر سمجھایا کہ دیکھو کلش! تم نواب صاحب کے باغ سے اکثر پھل توڑ لاتے ہو۔ اب وہاں ہرگز نہ جانا۔ ہاں اور کسی سے لٹنا وڑنا بھی نہیں۔ تم اپنے دوسرے بھائیوں سے بھی کہہ دو ورنہ سب کی چمڑی ادھیڑ دوں گا۔“

دفتر جاتے ہوئے وہ بڑی احتیاط سے سائیکل چلاتا رہا کہ کسی سے ٹکرو کر نہ ہو جائے۔ ایک دوکان دار سے کوئی سال بھر قبل اُس کی تو کوئی نہیں ہو گئی تھی۔ اس نے ادھر سے گزرنا ہی بند کر دیا۔ دوسرے دن اتفاق سے اُس کے دفتر میں ایک کلرک کو رشوت لیتے ہوئے پکڑ لیا گیا۔ اُس روز دفتر میں بڑا سناٹا رہا۔ رام لیٹا نے اس واقعہ کا سب سے زیادہ اثر لیا۔ ولینے وہ رشوت نہیں لیتا تھا۔ دراصل اس میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی۔ کلرک کی گرفتاری نے اس کے حواس گم کر دیئے تھے، گھبراہٹ کے باعث وہ سارا دن پریشان رہا۔ شام کو اس نے سوچا، جوتشی جی نے تین مہینے سخت بتائے ہیں۔ میرے لیے یہی بہتر ہے کہ دفتر آنا بند کر دوں۔ کون

جانے پولیس مجھے بھی رشوت لینے کے الزام میں خواہ مخواہ دھر لے؟ اس کی صرف دس دن کی تنخواہ والی چھٹی باقی تھی۔ کوئی خرچ نہیں، میں باقی چھٹی تنخواہ سے بغیرے لوں گا، دو تین مہینے ہی تو ہیں، کسی طرح کھٹ جائیں گے واپسی پر اُس نے ایک طواغرت کی منت سماجت کر کے سرٹیفکیٹ لے لیا اور چھٹی کی درخواست بھیج کر گھر بیٹھ گیا۔

اُس کی آواز کانپ رہی تھی، جوتشی جی کے کمرے سے اتر کر وہ سڑک پر پہنچا تو شام ہو چکی تھی، باہر کی دکانیں بجلی سے جگمگا رہی تھیں، سائیکل، موٹر سائیکل اور رکشے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ لوگ ہنستے بولتے گزر رہے تھے۔ رام لیٹا نے ذرا غصہ کر دیکھا۔ اُسے ایسا لگا جیسے وہ جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے کھڑا ہے اور تصور ہی تصور میں آزاد دنیا کا خواب دیکھ رہا ہے۔

کچھ دیر تک وہ یہی دیکھتا رہا پھر اس نے نگر پیر کھڑی ہوئی اپنی پرانی سائیکل تھامی اور گھر کی سمت چل پڑا۔ راستے میں ہنومان جی کا مندر پڑتا تھا۔ وہاں زور زور کے گھڑیاں بج رہے تھے۔ رام لیٹا نے ایک ہاتھ سے اپنی جیب ٹٹولی۔ کوئی روپے ڈیڑھ روپے کی ریزگاری موجود تھی۔ اس نے مندر کے سامنے سائیکل روک دی، اُتر کر چار آنے کا پرشاد خریدنا اور مندر میں چلا گیا۔ وہاں ہنومان کی مورتی کے سامنے دیر تک بنی کرتا رہا۔ ”بے سچ رنگ بلی، میرے ماتھے سے جیل کی لکیریں مٹا دو، میں اس مندر پر چاندی کا کلس چڑھاؤں گا،“ جب وہ لٹے پاؤں مندر سے واپس ہوا تو فاضل اندھیرا ہو چکا تھا۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کی سائیکل میں بٹی نہیں ہے وہ لڑ کر نیچے اتر آیا۔ اس پہلے بھی تو اسے حوالات میں ڈالا جا سکتا ہے؟ اس نے سوچا پھر کوئی ٹیل بھرنے میں بیدار رہتا ہو گا پھر جا پہنچا۔ ”کھانا لگا دوں،“ اُس کی بیوی نے پوچھا۔ پھر اس نے دوبارہ آواز دی: ”کلش! ذرا اپنے پتا جی کے ہاتھ دھلا دو۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔“

کلش پانی کا گلاس ہاتھ میں لے کر گئی تو سب سے پہلے اس نے اپنی کاپیوں کے بارے میں پوچھا جن کے لیے اُس نے باپ سے آج صبح کہا تھا۔ رام لیٹا نے کپڑے بدل چکا تھا۔ کاپیوں کا نام سن کر وہ آگ بگولا ہو گیا: ”دم لینے دو گی یا نہیں؟“ وہ چلا یا: ”کوئی مر رہا ہو، کوئی جی رہا ہو، یہاں تو کاپیاں آئی جا رہیں۔۔۔“

”کلش تم جاؤ،“ ایک اس کی بیوی اندر آ گئی، کتنی باتیں سمجھا رہے کہ ان کے آتے ہی کچھ نہ پوچھا کرو۔ کاپیاں آئی ہونگی تو مل جائیں گی؟

اس کی بیوی بڑے لچھے سمجھاؤ کی عورت تھی۔ بچوں کو بلاتی تو بڑے پیار سے، اگر دانٹتی بھی تو اس کا چہرہ مسکراتا ہی رہتا تھا۔ پوری زندگی اس نے شوہر کے ساتھ بڑی تنگی سے گزاری تھی۔ لیکن کبھی شکایت کا حرف زبان پر نہیں آیا تھا۔ کلش سے پانی کا گلاس لے کر اس نے شوہر کا چہرہ دیکھا جو بے حد اتر ہوا تھا۔ ماتھے پر پسینے



اس نے اپنے گھر کا ایک چھوٹا سا کمرہ صاف کر لیا اور اسی میں بستر ڈال کر پڑ گیا۔ اب اس کا معمول یہ تھا کہ صبح اٹھتا، ضرورت سے فارغ ہو کر رامائن کا پانچھ کرتا اور سو جاتا۔ سو کر اٹھتا تو پھر رامائن کا پانچھ کرتا۔ اس نے گھر والوں سے کہہ دیا کہ اگر کوئی ملنے آئے تو کہہ دینا کہ میں گھر نہیں ہوں۔ گھر والے اس کی اس تبدیلی سے کافی پریشان تھے لیکن کسی کو اس سے کچھ پوچھنے کی ہمت کہاں تھی بیوی نے پہلے سوچا، شاید یہ پاگل ہو گئے ہیں۔ لیکن رام لہجائے کی کسی بات سے پاگل بن کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ کوئی ایک ماہ تک یوں ہی ہوتا رہا۔ اب گھر میں خرچ کے لیے کچھ نہیں تھا۔ بلا تخواہ گھر چلانا آسان نہیں تھا۔ بیوی نے پہلے دو ماہ تک جو کچھ چھپا رکھا تھا، خرچ کیا اور اس کے بعد بے چاری کو اپنی چوڑیاں فروخت کر لی پٹریں۔ اس دوران میں ایک اور مصیبت بھی آگئی۔ ہوا یوں کہ رام لہجائے کی بڑی لڑکی کو محلے کے ایک غنڈے نے اسکول سے آتے ہوئے پکڑ لیا اور بدتمیزی پر اتر آیا۔ وہ تو گلی کے دو آدمیوں نے دیکھ لیا اور اسے چھڑا کر گھر چھوڑ گئے۔ بیوی نے جب یہ سنا تو سخت برہم ہوئی اور سیدھی بچھلے کمرے میں رام لہجائے کے پاس پہنچی۔ اور رامائن اس کے ہاتھ سے چھینٹے ہوئے اسے سارا قصہ سنا دیا۔ رام لہجائے سخت بڑا فروختہ ہوا۔ اس کا خون جوش مارتے لگا۔ وہ اس غنڈے سے واقف تھا۔ اس کا جی چاہا، اسی وقت گھر سے نکل کر جائے اور اس بد معاش کا سر قوڑ دے۔ لیکن فوراً اسے احساس ہوا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے؟ یہ راستہ تو سیدھا جیل جاتا ہے۔ مجھے اس موقع پر سنبھلنا چاہیئے ورنہ جوتشی کا کہنا ہو کر رہے گا۔ وہ سارا دن اندر ہی اندر کھولتا رہا لیکن باہر نہیں گیا۔ رات کو سوتے وقت اس نے سوچا، میں نے باہر نہ جا کر مصیبت ٹال دی ہے۔ اگر میں باہر نکل جاتا تو حوالات ہی میں ہوتا۔

کچھ دن اور گزر گئے۔ اس کی بیوی اس سے اکثر لڑکی کے بارے میں پوچھتی رہتی۔ ”سمجھ میں نہیں آتا کہ اس غنڈے کا کیا کیا جائے؟ میں تو سوچتی ہوں اس لڑکی کی اب شادی ہی کر دو؟ پھر وہ اس سے پوچھتی کہ آخر اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ داڑھی بڑھی ہوئی ہے۔ کپڑے گندے ہو رہے ہیں۔ آخر کچھ بتاتے کیوں نہیں؟“

پھر ایک دن وہ سر پر ہی سوار ہو گئی۔ ”آخر آپ کو یہ کیا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“

”کچھ نہیں۔ تو پھر آپ کام پر کیوں نہیں جاتے؟ گھر سے کیوں نہیں نکلتے؟“ بیوی نے مہر ہو کر کہا۔

رام لہجائے نے جواب نہیں دیا۔ اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ تین مہینے پورے ہو رہے تھے اور جوتشی جی کے کہنے کے مطابق صرف تین مہینے ہی بھاری تھے۔ اس کے بعد خطرہ نہیں تھا

”بتاؤں؟“ رام لہجائے نے کہا۔ اُسے خود اپنی آواز اجنبی لگی۔

”ہاں۔ بتائیے کیا بات ہے؟“

”تم پنڈت رام نرائن کو نہیں جانتیں؟ بہت بڑے جوتشی ہیں۔ اس شہر میں آئے تھے۔“

”پھر؟“

”پھر یہ کہ انھوں نے میری جنم کنڈی بنا کر بتایا تھا کہ تمہیں جیل جانے کا خطرہ ہے، انہوں نے کہا تھا کہ تم پر بھادوں، اسوج اور کاتک بھاری ہیں۔“

”جیل؟“ اُس کی بیوی ایک دم چونک گئی

”اور اسی لیے میں...“

”یہ جیل تو ہو گئی؟“ اس کی بیوی نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔

”کیا؟“ رام لہجائے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُس کی بیوی کیا کہہ رہی ہے؟

”جیل کیا کچھ اور ہوگی؟ تین مہینے سے آپ نے گھر سے باہر قدم نہیں رکھا۔ شکل دیکھیے تو داڑھی اور سر کے بال بری طرح بڑھے ہوئے ہیں۔ گھر میں تین مہینوں سے ایک پلیسہ نہیں ہے ہم کوڑی کوڑی کے محتاج ہو رہے ہیں۔ کیا یہ جیل سے کم ہے؟“

دوسرے لمحے اُس نے رام لہجائے کو بازو سے پکڑ کر کمرے سے باہر دھکیں دیا۔ جہاں سورج کی تازہ دھوپ ہر طرف پھیل رہی تھی۔

رام لہجائے نے بیوی کی باتیں سنیں تو اسے ایسا لگا جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے سے اندھیرا چھٹ گیا ہے اور روشنی پھیل رہی ہے۔

دوسرے روز وہ حجامت وغیرہ بنا کر حسب معمول اپنی پرانی سائیکل پر دفتر جا رہا تھا۔ ابھی چار دن کی چھٹی باقی تھی لیکن اس نے سوچا ”کام کروں گا تو کچھ پیسے ہی مل جائیں گے ورنہ...“

## بانسری

نرمیدر پکاش

ولیم میکین دراصل سکاٹ ہتھے۔ بعد میں امریکن شہری بن گئے تھے۔ وہ ساٹھ کے پینٹ میں ہوں گے جب انہوں نے اپنی بیوی کے ہمراہ دنیا کے سفر کا عزم کیا۔ معمولی معمولی سی پرانی، نادر چیزیں اکٹھی کرنا ان کا مشغلہ تھا۔ وہ جہاں بھی جاتے اپنے مطلب کی کوئی نہ کوئی چیز ضرور کرید نکالتے۔

زمین کا گز بنے ہوئے جب وہ پہلی پہنچے تو لال قلعہ دیکھنے کے بعد وہ اپنی کرائے کی آرام دہ گاڑی کو گھا کر جامع مسجد کے سامنے لے آئے۔ انہوں نے گاڑی ایک جگہ پارک کر دی اور میز میکین کا ہاتھ تھامے آہستہ آہستہ اس مقدس مسجد کے گرد پھیلی ہوئی پٹریوں پر اپنی پسند کی چیزیں ڈھونڈنے لگے۔ جگہ تو انہیں بچ گئی، مگر کوئی چیز انہیں پسند نہیں آ رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ ایک تاریک سی گلی میں گھس گئے، جس میں حاجی مشہد جو کا کباڑ خانہ تھا۔ دکان کے باہر ساٹن بورڈ لگا ہوا تھا ”خزینہ“

بے ہنگم سی نیم تاریک دکان اور اس میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے پرانے بوسیدہ سامان کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں ایک پراسرار چمک پیدا ہوئی۔ دکان میں گھستے ہی دائیں ہاتھ کو، کالسی کی گھنٹوں، پینل کی سرے دانیوں، تابنے کی صراحیوں اور چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے پتروں کے درمیان بدھ کی ایک مورتی رکھی تھی جس کے دھڑکا بایاں حصہ غائب تھا۔ مورتی کا ہلکا زرد پتھر کافی پڑ کش تھا۔ ولیم میکین کے ذہن میں اپنا وہ ”میوزیم“ گھوم گیا جو وہ واپس جا کر نیویارک میں بنانا چاہتے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ اپنے عجائب گھر میں وہ اس سفر کے دوران میں خریدے ہوئے سارے نوادرات رکھیں گے اور لاکھوں ڈالر کمائیں گے۔ وہ سوچنے لگے اگر وہ اس مورتی کے ساتھ کوئی بڑی ہی پراسرار کہانی وابستہ کر لیں تو سارے سفر کا خرچ اکیلی یہ مورتی ہی انہیں دے جائے گی۔

انہوں نے ایک مشاق خریدار کی طرح اس مورتی کی بجائے دوسری چیزوں کی قیمتیں دریافت کرنا شروع کر دیا۔ حاجی مشہد جو دست بستہ ان کے قریب کھڑا ایک چیز کا حسب نسب واضح کرتے ہوئے ان کی قیمتیں بتاتا جا رہا تھا۔ میکین اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دے کر آگے بڑھ جاتے اور فوراً ہی دوسری چیزوں کی طرف پلکتے۔

آہستہ آہستہ وہ دکان کے اندر درون تک چلے گئے۔ مشہد جو نے بتایا روشن کردی تھیں۔ ہلکی زرد روشنی میں یہ سب چیزیں واقعی کسی کھنڈر کے تنہ خانے میں کئی صدیوں سے پڑی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

دیوار میں بنے ہوئے ایک چھوٹے سے خانے کے سامنے جا کر وہ ٹھٹک گئے۔ اس پر لکڑی کے فریم کا ایک دروازہ تھا۔ جس میں شیشہ لگا تھا اور اندر گہرے سبز رنگ کا عملی کپڑا بچھا ہوا تھا۔ جس پر سیاہ آئینوں کی ایک بانسری رکھی تھی اور اس پر چاندی کے مہین تار سے پھلتے بنے ہوئے تھے۔ اور ایک بڑے ہی پرانے سے سفید کاغذ پر جواب قریباً زردی مائل ہو گیا تھا، انگریزی میں لکھا تھا۔ ”فروخت کے لیے نہیں۔“

”کیوں؟ یہ فروخت کے لیے کیوں نہیں؟“ ولیم میکین نے مشہد جو کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔

”اوہ جناب! اس کے بارے میں کچھ نہ پوچھئے۔ یہ میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ میرے جوان بیٹے کی یہی تو ایک نشانی ہے میرے پاس جو اس بڑھاپے میں مجھے یوں بے سہارا اچھوڑ کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔“ مشہد جو نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جواب دیا اور اپنے کندھے پر رکھے ہوئے بڑے سے زرد رومال سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگا۔

ولیم میکین نے اپنی بیگم کو اشارے سے پاس بلایا۔ وہ دوسری طرف چیزیں دیکھنے میں مصروف تھیں۔ جب وہ قریب آگئیں تو انہوں نے مشہد جو سے دریافت کیا۔ ”ہاں، ہاں، کیا ہوا تھا؟“ ”کچھ نہیں جناب۔ اس ذکر سے میرا کلیجہ بیٹھا جاتا ہے۔“ مشہد جو نے موہنہ پھیر لیا۔ جیسے وہ اپنے چہرے کے جذبات کا اتار چڑھاؤ پھپھانا چاہتا ہو۔

”اوہ۔ کافی دل چسپ کہانی ہے۔!“ ولیم میکین نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ اور پھر مشہد جو کو ہزار واسطے دے کر کہانی سناتے پر مجبور کر ہی دیا۔

”ہم کشمیر کے رہنے والے ہیں،“ مشہد جو نے داستان شروع کی، ”جہاں اونچے سڑی پہاڑوں پر برف دیوتاؤں کے آشیرداد کی طرح آہستہ آہستہ گرتی رہتی ہے اور ہمارے گاؤں کے راستے سو رنگ سے جاملتے ہیں۔ صدیوں سے ہم اسی گاؤں میں رہتے

آ رہے تھے۔ میرا ایک لڑکا تھا رحیم جو۔ وہ رات کو جب چاند دیوار کے پتوں سے اٹھکیلیاں کرنے کے لیے ٹھک آتا تو اپنی بانسری لے کر در سفیدوں کے جھنڈ میں گھس جاتا اور ایسے ایسے راگ نکالتا جن کے جادو سے ہستی ندی میں پھدکتی ہوئی پھیلیاں کناروں پر اجمائیں اور پانی سے سر باہر نکال کر جھومنے لگتیں۔

ایک بار جب برف پگھل کر جہلم کے کناروں کی طرف بھاگنے لگی، سفیدے سرد اور شاہ بلوط پر نئی کوئیلیں پھوٹنے لگیں اور جہلم کے کنارے بید غنوں لرزے لگے تو ایک چاندنی رات کو رحیم جوانی بانسری لے کر سفیدوں کے جنگل کی طرف بڑھ گیا۔ رات بھر اس کی بانسری کا جادو جاگتا رہا۔ پھر چاند سو گیا اور کائنات جاگ اٹھی۔ مگر رحیم جو واپس نہ آیا۔ بھر دوپیر کو ہم اسے ڈھونڈنے نکلے۔ دور جنگل میں درختوں سے جھڑے ہوئے زرد پتوں کے ایک انبار میں لٹا ہوا تھا اور اس کے سینے پر ایک دو شیرہ سر رکھے اندھھی پڑی تھی۔ ہم نے آوازیں دیں۔ ہلایا جلا یا مگر نہیں۔ وہ تھا ہی کہاں؟ آخر پتہ چلا کہ کسی ناگن نے دونوں کو ڈس لیا ہے۔ رحیم جو کے ہاتھوں میں یہی بانسری تھی۔“

اس سے آگے مشہد جو کچھ نہ بولا۔ اپنے زرد رومال میں مونہہ چھپا کر سامنے پیچھ ہوئے تخت پوش پر جا بیٹھا۔ جب وہ داستان سنا رہا تھا، تو میکین سب کچھ سوچ چکے تھے۔ وہ اس بانسری کو اپنے میوزیم میں رکھیں گے اور یہ ساری داستان اس کیچوں کے ساتھ لکھوا کر اس کے ساتھ دیوار پر لگا دیں گے۔ اور اسے کبھی نہ پھیں گے۔

## پرچھائیاں یونس احمد

گیتا کے بارے میں بہت لوگوں سے باتیں سن چکا تھا۔ لیکن یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ گیتا نہ صرف بہت بڑی رقا صہ تھی۔ بلکہ اداکار بھی تھی۔ اس نے رقص اور اداکاری کے فنون کو نہایت جانفشانی سے حاصل کیا تھا۔ اس کی فلموں کے لئے لوگ اسی طرح چشم براہ رہتے تھے جیسے کوئی حسن جہاں تاب کو دیکھنے کا منتظر ہو۔ اس کے رقص میں زندگی کا حسن و جمال ہوتا تھا۔ اس کی لمبی لمبی انگلیاں فصفا میں یوں متحرک ہوتی تھیں جیسے آسمان پر ستارے لٹکے چمکیں رہے ہوں۔

اور جب میں نے اسے یوں براہ سر طور پر کار میں بیٹھ ہوئے

میں تھپڑ روڈ پر چلتے چلتے ایک دم رُک گیا۔ اس وقت شام کا سرمی اندھیرا پھیل چکا تھا اور سڑکوں کی بتیاں جلنے لگی تھیں میں بارہا اس رومانی سڑک پر سے گزرا ہوں۔ لیکن آج اس جگہ گیتا کو دیکھ کر میں دم بخود رہ گیا۔ وہ شیفون کی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ بالکل سفید ساری۔ لیکن بلاؤز ہلکے نارنجی رنگ کا تھا۔ میں ابھی سے بھرپور نگاہوں سے دیکھ ہی رہا تھا کہ پیچھے سے اس کے سامنے ایک کار آگرمی۔ دروازہ کھلا وہ اندر بیٹھ گئی۔ یہ سب اتنا آنا نا ہوا کہ میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے پردے پر کوئی ناٹک ہو رہا ہو۔

”ناشتہ میرے ساتھ کرنا“ اس نے بڑی بے تابی سے جواب دیا۔  
 ”نہیں اس میں تو کوئی گہرا راز معلوم ہوتا ہے“ میں نے بالور میں کھنگھی کرتے ہوئے کہا۔  
 سریندر کو ہنسی آگئی۔ معلوم ہوتا ہے ان دنوں تم بھی جابو ناول پڑھ رہے ہو۔ جیسی بات دراصل یہ ہے کہ آج گیتا کے ساتھ اپائنٹمنٹ ہے!“

”گیتا؟“ میں سوالیہ نشان بن گیا۔  
 ”جی ہاں، وہی گیتا، جس کا قصہ تمہیں بہت پسند ہے۔ اور“  
 ”یعنی وہ رقصہ؟“ میں نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا۔ لیکن تمہارے ساتھ اپائنٹمنٹ؟ مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟“  
 ”ہاں کنگن کو آرسی کیا؟ چلو میرے ساتھ!“ سریندر کے بے اعتمادی کی ہلک نظر آ رہی تھی۔

”لیکن؟“ اور اتنا کہہ کر میں رک گیا۔ میں اصل میں نروس ہو رہا تھا، گیتا کے ساتھ بات کیسے کروں گا۔  
 ”لیکن دیکھ میں کچھ نہ سنوں گا۔ دس بجے اس کے ساتھ اپائنٹمنٹ ہے۔ اور اس وقت تو بج چکے ہیں!“ اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بس اب کوئی حیلہ نہ تراشو؟“  
 ”لیکن تم نے یہ تو نہیں بتایا کہ ملنے کا وعدہ کیا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ آخر کس موضوع پر بات کرو گے؟“

”پیارے میں فلم ریویو کا نمائندہ بن کر جا رہا ہوں۔ اس سے انٹرویو لیا ہے۔ ویسے پرسوں رسمی طور پر مل چکا ہوں!“  
 ”تو یوں کہو۔ فلم ریویو میں ملازمت کب کر لی تم نے؟“  
 ”محض گیتا سے انٹرویو لینے کے لیے ملازمت کی ہے!“ اس کے ہونٹوں پر ہر اس رسمی مسکراہٹ تھی۔  
 ”تو مجھے نہ لے جاؤ اپنے ساتھ!“

”تمہاری وجہ سے مجھے اخلاقی تقویت ملے گی پیارے!“  
 سریندر نے اپنے گھر میں ناشتہ کرایا۔ اور پھر ہم گیتا سے ملنے کے لئے روانہ ہو گئے۔

گیتا ان دنوں تھیںڈوڈ کے ایک بینگلہ میں رہتی تھی جو خوب صورت سا بینگلہ اونچے اونچے درختوں سے ڈھکا ہوا جسیں اور خوش رنگ پھولوں کے ان گنت گندے بھی بہت قریب سے رکھے ہوئے تھے۔ جب راتوں کو اس کے گھنگھروؤں کی دلفریب آوازیں ہواؤں میں مل کر ابھرتیں تو مڑک پر اس کے دیوانوں کا جھوم لگ جاتا تھا۔ یوں بھی اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے نہ جانے کتنے دیوانے اس کے بینگلہ

دیکھا تو میرے دل کی دھڑکن رک سی گئی۔ زندگی کتنے روپ بدل بدل کر میرے سامنے سے گزرتی رہی۔ اب میں فٹ پاتھ پر آگیا۔ اٹھارہ گھنٹہ ہو گیا تھا اور اس گھرے اندھیرے میں سڑکوں کی بتیاں کتنی ہی داستانوں کو جنم دے رہی تھیں۔ داستانیں ہر جگہ جنم لیتی ہیں۔ انسان کی زندگی میں بھی اور سڑکوں کی بتیوں کے پیچھے بھی اور میں ان داستانوں کی زنجیروں میں جکڑتا گیا۔  
 ”بیلو سوئیٹی!“

پیارہ بھری آواز میری کنپٹیوں کو گرماتی چلی گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ لیکن کہیں کوئی نہ تھا۔ چلتے چلتے میں ایک لمپ پوسٹ کے نیچے اگڑک گیا۔ میں نے سگریٹ جلایا۔ ایسے لمحات میں سگریٹ دل و دماغ کو سکون پہنچاتا ہے۔ مجھے سگریٹ کے اشتہار کے الفاظ یاد آ گئے۔ لوگ کس کس انداز سے اپنے آپ کو فریب میں مبتلا کرتے ہیں۔ اس لمپ کے نیچے، میں زیادہ دیر تک کھڑا نہ رہ سکا۔ کیونکہ آج پینٹے جوق در جوق اس کے ارد گرد جھومر مچ رہے تھے۔ اس لئے کہ آج دیوالی تھی۔ میں چلتا گیا۔ اوباشوں اور بے فکرؤں کی طرح۔ ان لوگوں کی طرح جنہیں دنیا کا کوئی غم نہیں ستاتا۔ جو عیش کوشیوں ہی کو زندگی کو سب سے بڑی معراج سمجھتے ہیں۔ تھیرڈ ورلڈ کلکتہ کی وہ۔۔۔ شاہراہ بے جہاں شرفاء رہتے ہیں جس کے دونوں طرف خوبصورت مکانات ہیں۔ جس پر سے کاریروں گزرتی ہیں جیسے یہ پل صراط ہو۔ آہستہ آہستہ رینگ رینگ کر، سنبھل سنبھل کر، یہاں شام کے بعد سے جوہی اور چنبیلی اور موگرا کی خوشبوئیں شاعری کو جنم دیتی ہیں۔ سنئے سنئے لطیف اور نازک خیالات کی تخلیق کرتی ہیں۔ یہاں عشق اور حسن کا تصادم ہوتا ہے۔ یہاں رخساروں کی گرمی اور زلفوں کی معطر ہواؤں میں زندگی ٹھہرتی اور سنورتی ہے۔ اور میں اس شاہراہ پر آوارہ خرام ہوں۔ اکیلا! البتہ دماغ میں خیالوں کا جھوم ہے۔ اس لئے کہ یہ شاہراہ خیالات کو جنم دیتی ہے۔ دلوں اور آرزوؤں اور تمناؤں کو ابھارتی ہے، اس لئے کہ اسی شاہراہ پر حسن کی شفق چھوٹتی ہے اور عشق میگھ ملہا رگاتا ہے اس لئے کہ میں نہیں اس شاہراہ کے ایک بینگلہ میں گیتا سے ملا تھا۔ اس حادثہ کو کس سال گزر گئے۔ وہ بینگلہ ابھی اور آگے ہے۔ میں اسی بینگلہ کی طرف بڑھتا جا رہا ہوں!

جب میں کلکتہ یونیورسٹی میں ایم اے کا طالب علم تھا اور ہوسٹل میں رہتا تھا ایک اتوار کی صبح تھی۔ میں نہادھو کر فارغ ہوا ہی تھا کہ سریندر آگیا۔

”جلدی کپڑے بدلو اور میرے ساتھ چلو!“ اس نے کہا۔  
 ”بات کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

سے گرد پکڑ کاٹتے تھے۔

جب ہم گیتا کے بنگلے کے پاس پہنچے تو سریندر نے اپنی رست واضح دیکھی۔

”ٹھیک دس بجے ہیں“ اس نے کہا۔

لیکن میرا دل اندر ہی اندر دھڑکنے لگا تھا۔ تصور اور حقیقت میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ تصورات کی دنیا میں نہ جانے کتنی بار گیتا سے مل چکا ہوں۔ اس کے فن کی تعریفیں کر چکا ہوں۔ لیکن آج جب وہ تصور حقیقت بن رہا تھا تو میرے اندر کا انسان جو بزدل ہے جاگ اٹھا اور اس کے سامنے جاتے ہوئے پاؤں کا پٹنے لگے۔ کئی بار واپس چلے جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن نہ جاسکا اس لیے کہ اپنی بزدلی سریندر پر بظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ سریندر مجھے بہادر سمجھتا تھا اور اسے میری وجہ سے تقویت مل رہی تھی۔

ہم ابھی دروازے کے اندر داخل ہونا ہی چاہ رہے تھے کہ سامنے گیتا کھڑی نظر آئی۔ اس کی سنبل جیسی سیاہ زلفیں شانے سے ترتیب سے بکھری ہوئی تھیں اور بڑی بڑی کنول جیسی آنکھیں میں دیکھ رہی تھیں جیسے وہ بہت دیر سے ہمارا انتظار کر رہی ہوں۔ یکایک اس کے ہونٹ مسکرائے اور آنکھوں سے کئی بام چھلک گئے۔

”میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی“ اس نے سریندر سے مخاطب ہو کر کہا۔

”دیکھئے ٹھیک دس بجے ہیں“ سریندر نے اپنی بریڈنٹی گھڑی دکھاتے ہوئے کہا۔ جیسے اس نے یہ گھڑی آج ہی خریدی تھی۔ اس کے بعد اس نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”یہ ہیں میرے دوست مسٹر مکمل ایم۔ اے کے طالب علم، لیکن آرٹ کے دیوانے افسانے بھی لکھتے ہیں۔ ان کے کئی افسانے تو شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں“ یہ سن کر گیتا نے دونوں ہاتھوں سے آداب کیا۔ میں نے بھی مشکل سے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کی۔

”اندر تشریف لے چلئے؟“ گیتا نے اپنی محرومی انگلیوں سے اشارہ کیا۔

اس وقت وہ ننگے پاؤں تھی، جو بلور کی طرح چمک رہے تھے۔ اتنا کہہ کر وہ یوں مڑی جیسے یہ بھی بھارتیہ ناٹیم کا ایک پوز ہو۔ اور میرے دل میں گھٹنگھرونج اٹھے۔ نومبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ لیکن سرد ہواؤں میں اب تک برف جیسی ٹھنڈک نہیں سمائی تھی۔ اور اسی لئے گیتا کے جسم پر ہلیمین نہیں تھا۔

لیکن ڈرائنگ روم کی کھڑکیاں بند تھیں۔ اس لیے ماحول میں شاعرانہ فضا پیدا ہو گئی تھی۔ ڈرائنگ روم اچھا خاصا بڑا تھا لیکن تصویر صرف ایک ہی نظر آئی وہ بھی گیتا کی۔ تصویر کیا تھی جیسے ابھی ابھی غنچہ پھول بنا ہو۔ گلاب جیسی شگفتگی، پورنیا جیسی چاندنی اور.... اور ابھی میں ہرزوایے سے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا کہ گیتا کی ہلکی سی ہنسی میرے کانوں میں رس گھول گئی۔ ”کنول جی! آپ اتنے عجز سے کیا دیکھ رہے ہیں“ اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میری سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی۔

”جی جی... کچھ نہیں.... میں...“

اور پھر وہ ہلکی ہنسی سے نغمہ بن گئی۔ جیسے تاروں پر مضراب لگ گئی ہو۔ ”بڑے شرمیلے ہیں آپ تو“

”پہلی ملاقات میں یہ ذرا مشکل سے کھلتے ہیں مس گیتا!“ سریندر نے کہا۔ ”البتہ میں بے تکلف بن جاتا ہوں“ مس گیتا کی ہنسی کے بدلے پھر ابھرے اور میرے جذبات کے گہرے سمندر میں آکر ٹوٹ گئے۔ میں گیتا کو مھوڑی مھوڑی دیر کے بعد دیکھ لیتا تھا۔ اس کے رنساڑوں میں کیسی تمنا ہٹ تھی۔ اس کی آنکھوں میں کیسی افسوں طرازیوں تھیں اور ہونٹوں میں کتنے شعلے ترپ رہے تھے۔ اور جب ہماری آنکھیں ایک دوسرے سے ٹکرا جاتیں تو میں شرماتا۔ اتنی بڑی رقاہد کے سامنے بیٹھنا ہی بڑی جرأت کا کام تھا۔

سریندر اس سے سوال کرنا گیا۔ وہ جواب دیتی گئی اور میں سنتا رہا۔ اس نے فنِ رقص کو اپنے خون جگر سے

سنپا تھا۔ اور وہ اسے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز رکھتی تھی۔ اس نے بیٹھوں کا لچ میں انٹرٹیک تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن رقص کا ایسا جنون سوار ہو کر تعلیم جاری نہ رکھ سکی۔ باپ نے اس کے اس شوق کو اور ہوا دی اور ایک دن سچ مچ اس کا خواب حقیقت بن گیا۔ سب سے پہلے امپریس تھیٹر کے اسٹیج پر اس نے اپنے رقص کا مظاہرہ کیا۔ تھا۔ وہ رات اس کی زندگی میں یوں آئی تھی جیسے شبِ عروسی ہوا۔

”میں بھی اس رات وہاں موجود تھا“ نہ جانے یہ الفاظ کیسے میری زبان سے نکل گئے کہنے کو تو کہہ گیا۔ لیکن مجھ پر جیسے بجلی گر پڑی تھی۔ لیکن گیتا کے ہونٹ مسکرائے تھے اور وہ پوچھ بیٹھی تھی۔ ”تو سچ مچ بتائیے آپ کو میرا ناچ کیسا لگا تھا؟“

اس کی آنکھوں میں انا کی چنگاریاں تھیں۔ میں نے ذرا جرات

سے کام لیا، اور یہ مس گیتا! آپ کے ناز کی تعریف اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے سارے مناظر زندہ ہیں۔ میں اس رات کو بھول نہیں سکتا!

اتنے میں چائے آگئی اور گفتگو کا موضوع بدل گیا۔

اب میں اس دن کے بعد سے برابر گیتا کے ہنگلے پر جانے لگا۔ نہ جانے اسے میری ذات سے دلچسپی کیوں ہو گئی تھی۔ شاید دلچسپی کی وجہ یہ ہو کہ میں اس کے فن کا سب سے بڑا انداز تھا۔ رفتہ رفتہ میرے تصورات کی پرچھائیاں بھی گہری ہوتی نکلیں اور دل کی کلیاں شگفتہ ہونے لگیں۔

وہ رات بہت ہی سہانی تھی۔ اماکس کی رات میں، میں نے ایسا سہانا پن کبھی نہیں دیکھا تھا۔ خلاف معمول رات کے بارہ بج گئے تھے اور میں گیتا کے ڈرائنگ روم میں اس کی زلفیں دیکھ دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اماکس کی رات میں اس کا حسن کتنا نکھر گیا تھا۔ اس کی پلکوں کے پیچھے کتنے چاند ستارے فروزاں تھے اس کے ہونٹوں میں گیتوں اور نغموں کی پھیلیں تھیں، اس کے مکالمے میں کتنی مٹھاس تھی۔ میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”گیتا اب اجازت دو!“

”نہیں سوٹی!“

اور یہ کہہ کر وہ قریب آکر بیٹھ گئی۔

اس نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ کی شفق چھوٹ پڑی۔ میں پریشان ہو رہا تھا۔ پہلی بار اس کی عجیب غریب حرکت سے ڈر گیا تھا، وہ مجھ سے بالکل قریب آگئی۔ یہاں تک کہ اس کا کھلا ہوا بلدیں بازو میری ریشمی قمیص سے مس ہو گیا۔

”زندگی میں ایسی رات بہت کم آتی ہے مکمل فن تو نہیں مرتا، لیکن یہ رات مرجٹے گی۔ اور تم پھر ایسی رات کے لئے تڑپو گے!“

”گیتا! کیا کہہ رہی ہو تم؟“

”تو تم کچھ نہیں سمجھتے؟“ اتنا کہہ کر اس نے قدم بلند کرنے کی کوشش کی لیکن وہ فوراً سنبھل گئی یہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں؟“

”نہیں میں تمہارا عاشق نہیں، تمہارے فن کا عاشق ہوں، میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔“

”جھوٹ!“ اور اس بار سچ مچ اس کا قہقہہ بلند ہو گیا۔ مکمل! یہ نہ بھولو کہ فن مجھ سے زندہ ہے۔ میں نہیں تو فن بھی نہیں، اس طرح اپنے آپ کو قریب نہ دیا کرو۔ پہلے مجھ سے پیار کرنا سیکھو، پھر میرے فن سے عشق کرنا۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ اماکس کی رات میں انسان اپنا دماغی توازن کھود دیتا ہے!“

میں نے گیتا کے اندر اس سے پہلے ایسی تبدیلی نہیں دیکھی تھی اس نے میرے ساتھ کبھی ایسی بات نہیں کی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں۔ یہ سچ ہے کہ میں اس کے فن کا پرستار تھا۔ اس کی زلفوں کی مہک سے ابدی مسرت حاصل کرتا تھا۔ لیکن اس پر کبھی ظہر نہ ہونے دیا میں اس سے بارہا کہہ چکا تھا کہ میں اس کے فن کا پرستار ہوں۔ لیکن آج وہ اتنی بے تکلفی سے بوجھ بیٹھی تو میں سہم گیا اور سوچنے لگا کہ کہیں اس پر میری محبت کا راز افشا تو نہیں ہو گیا؟ وہ مجھے دیر تک گھورتی رہی اور میں بت بنا کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا: ”اتنی جلدی کہاں جاؤ گے۔ تو میں گھنگرو بانڈھتی ہوں اور۔۔۔۔۔“

”نہیں؟“ میرے اندر کے بزدل انسان کو یکایک جرأت ہوئی۔ میں جاتا ہوں۔ اب کبھی نہ آؤں گا۔ پیار سریندر سے کرنا، لیکن وہ گھنگرو بانڈھ چکی تھی اور رقص کا سیلاب اٹھانے ہی والا تھا کہ بجلی یکایک بجھ گئی۔ اور سریندر کا قہقہہ گونجا اور مکمل! جاؤ رات بہت ہو چکی ہے!“

دیکھتے ہی دیکھتے سریندر اور گیتا کی محبت کی داستانیں پھیل گئیں۔ فن کا چراغ آہستہ آہستہ دم توڑتا گیا۔ لیکن عشق کی جوالا بھڑکتی گئی گیتا نے رقص میں حصہ لینا تقریباً بند کر دیا تھا۔ اداکاری سے بھی اس نے کندہ کشی کر لی تھی۔ اس نے سچ کہا تھا۔ فن مر رہا تھا اور عشق کے شعلے آسمان پر ستاروں کی طرح بکھر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دن عشق کی گرم بازاری بھی سرد پڑ گئی تھی۔ سریندر کثرت شراب نوشی کے وجہ سے میڈیکل ہسپتال میں دم توڑ چکا تھا۔ اس واقعہ کے بعد گیتا تھلیٹر روڈ سے منتقل ہو کر بالی گنج چلی گئی۔ اور اس طرح اس شاہراہ کا بھی سہاگ اجڑ گیا۔ کبھی کبھی جب میرے اندر کا بزدل انسان جاگ اٹھتا ہے تو میں اماکس کی اس رات کی یاد تازہ کرنے کے لیے تھلیٹر روڈ پر آ جاتا ہوں اور پھر میرے کانوں میں گھنگروں کی آوازیں قیامت برپا کرنے لگتی ہیں۔ اور آج جب میں نے اسے اتنے دنوں کے بعد یہاں دیکھا تو دس سال کی پھلی یادیں تازہ ہو گئیں۔ میں اس ہنگلے کی طرف بڑھتا گیا دس سال کے طویل سفر نے شاید ازل کے دل کے نہاں خانے سے میری یادوں کی شمعیں بھی بجھا دی تھیں۔ اور ان شمعوں کی جگہ اب نہ جانے کتنی شمعیں فروزاں ہوں گی!

میں اس ہنگلے کی طرف بڑھتا گیا۔ اور چمپا کی خوشبو پھیلی گئی۔ کسی کسی عمارت پر دیوالی کے چراغ روشن کئے گئے تھے۔ رات جگ مگ کر رہی تھی۔ جیسے اماکس کی رات نہ ہو۔ گیتا کا ہنگلے

قریب آگیا تھا وہاں بھی دیوالی کے چراغ جگ مگ کر رہے تھے۔  
لیکن اب وہ بنگلہ گیتا کا تو نہیں!۔ یکایک گھنگروں کی آوازیں سنائی  
دیں۔ میرے اندر کے بزدل انسان کو پھر حرکت ہوئی۔ اس کی رگوں  
کا منہ خون پھر کھول اٹھا۔ ”گیا گیتا۔ گیتا پھر اس بنگلہ میں آگئی؟“ میرے  
قدم گیٹ کے اندر ہی جانے والے تھے کہ کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔  
میں چکر اساک گیا۔ ”آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟“ میں نے دیکھا  
میرے سامنے سپاہی کھڑا تھا۔ میں کیسے کہتا کہ کبھی اس کمرے میں گیتا  
رہتی تھی اور میں بلا روک ٹوک یہاں روزانہ آتا تھا۔ اس سے پہلے  
کہ میں کچھ کہتا سپاہی بول اٹھا ”بالو جی! منتری جی رہتے ہیں یہاں،  
اس کو طعی میں، منتری کمل واس گیتا!“ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں

منتری بن گیا ہوں۔ اسلئے میرا نام بھی کمل ہے۔ اب گھنگروں کی آوازیں  
بند ہو گئیں تھیں۔ میں اب بنگلے سے کچھ دور لیمپ پوسٹ کے نیچے  
کھڑا ہو گیا۔ میری پرپھانیں مختصر ہو گئیں۔ لیکن پتنگوں کی تعداد میں  
برابر اضافہ ہوتا گیا اور میرے کانوں میں یہ آواز گونج رہی تھی ”پہلے  
مجھ سے عشق کرنا سیکھو، پھر میرے فن سے!“ اور شاید اب وہ  
منتری کنولی سے یہ کہہ رہی ہوگی ”میرے فن کو آپ جیسے فن کے  
عاشق کو جلا ملتی ہے!“ اور منتری کمل کے اندر کانڈر انسان اسے پیار  
کرتا ہوا کہہ رہا ہوگا ”تمہارے حسن کی روشنی سے میرے عشق کا  
چراغ جلتا ہے!“

## مکمل غلطی

### محمد یونس حسرت

ہے یا اس کے کسی بھی اور دوست یا واقف کار سے ایسی حرکت ہو  
سکتی ہے۔ اس لیے کہ الفاظ کی شکل ناموس تھی اور کارڈ لگتے  
یا آرٹ پیپر کا نہیں، سونے کا تھا۔ غالباً خالص سونے کا۔  
سام ویبر کی حیرت اور دلچسپی میں اضافہ ہو گیا۔ نہایت اشتیاق  
اور تجسس سے اُس نے کارڈ الگ کیا، بکس پر لیٹا ہوا کاغذ نکال کپڑا  
علیحدہ کر کے بکس کو دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ بکس کا کوئی ٹھکانا  
تھا نہ پتلا۔ کہیں کوئی جھوٹ، بیچ، کٹڈی یا قبضہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔  
ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ بھورے رنگ کی کسی چیز کا ٹھوس  
مکعب ہے۔ سام ویبر بڑی دیر تک اس ٹھوس مکعب کو الٹ پلٹ  
کر دیکھتا رہا اور پھر اسے فرش پر پٹختے ہوئے کہنے لگا:  
”عجیب تحفہ ہے یہ بھی، جس کا نہ سر ہے نہ پیر“  
وہ چند لمحے تک اس کی طرف دیکھتا رہا اور  
پھر اپنے بستر کی طرف بڑھتے ہوئے  
بکس کو ٹھوکر ماری ”جہنم میں جاؤ نہیں کھلتے تو نہ کھلو!“  
اور بکس ایک دم کھل گیا۔ اس کے اوپر کے حصے میں  
ایک درز نمودار ہوئی جو آہستہ آہستہ پھیلتی گئی اور پھر بکس کا۔  
اوپری حصہ دونوں طرف سمٹ گیا۔ ایک بار پھر سام ویبر حیرانی سے  
دیکھتا رہ گیا۔ پھر اُسے اپنے اُن الفاظ کا خیال آیا جو اس نے کہے تھے۔  
”اب بند ہو جاؤ!“ اس نے کہا بکس بند ہو گیا۔ ایک بار پھر اس  
نے ٹھوس کی شکل اختیار کر لی۔

ایک سپر لیس کمپنی کا آدمی بکس دروازے پر چھوڑ کر نیچے اتر آیا۔ سام  
ویبر نے بکس کو اندر کی طرف دھکیلنا شروع کیا۔ بکس بہت بھاری تھا اور  
سام ویبر یہ سوچ کر حیران ہونے لگا کہ ایک سپر لیس کمپنی کا آدمی، جو  
صورت شکل سے چالیس پچاس سال کا نظر آتا تھا، کس طرح اس  
بھاری بکس کو اٹھائے۔ تیسری منزل پر اس کے کمرے تک پہنچا  
ہوگا۔ سام ویبر نے جب اس سے یہ پوچھا تھا کہ یہ بکس کس  
نے بھیجا ہے تو اس نے رکھائی سے جواب دیا تھا:  
مجھے کیا پتہ۔ ہم مال بھیجتے تھوڑی ہیں، ہم تو صرف پہنچا دیتے  
ہیں۔“

سام ویبر بکس کو بڑی مشکل سے دھکیلتے ہوئے اپنے کمرے  
میں لایا۔ اپنے کمرے کے تنہا بلب کی روشنی میں اُس نے بکس کے  
ساتھ لگے ہوئے چمکتے دھکے ہوئے کارڈ کو دیکھا۔ جس پر اس کا نام اور  
پتہ درج تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک خوبصورت بیل دار حلیے کے اندر  
لکھا تھا:

”کرسمس سال ۲۰۱۱، مبارک!“

”کیا مذاق ہے؟“ سام ویبر نے اپنے جی میں کہا: آخر کون مجھ  
اب سے سو سال بعد کی کرسمس کے لیے مبارک باد دے سکتا ہے؟  
کس کے دماغ میں یہ احمقانہ خیال آیا ہے؟ ہو سکتا ہے میرے لا  
کالج کے ہم جماعتوں میں سے کسی نے یہ شرارت کی ہو؟ لیکن اُسے  
یقینی نہیں آ رہا تھا کہ اس کا کوئی سابقہ ہم جماعت ایسی شرارت بھی کر سکتا



”کھل جاؤ،“ بکس کھل گیا۔

”خوب،“ سام ویبر نے اپنے جی میں کہا ”بکس کے کھولنے اور بند کرنے کا طریقہ تو معلوم ہو گیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس میں ہے کیا؟ وہ جھک کر بکس کے اندر دیکھنے لگا۔ اس میں الماریوں کی طرح بہت سے خانے بنے ہوئے تھے۔ ان خانوں میں شیشیاں تھیں جس میں نیلے رنگ کی کوئی سیال شے بھری تھی۔ مرتبان تھے جن میں سُرخ رنگ کا کوئی ٹھوس مادہ بھرا ہوا تھا، شفاف ٹیوبیں تھیں جن میں سے زرد، سبز، نارنجی، ارغوانی اور دیگر بہت سی قسم کے رنگ جھانک رہے تھے۔ ڈبے کے نچلے حصے میں کسی پیچیدہ مشین کے سات اجزا پڑے تھے۔ ایک کتاب بھی اندر رکھی تھی۔

سام ویبر نے کتاب اٹھالی۔ اس کے تمام ورق کاغذ کے بجائے کسی دھات کے تھے۔ اس کے باوجود یہ کتاب کاغذ کی بنی ہوئی کتاب سے بہت ہلکی معلوم ہوتی تھی۔ وہ کتاب ہاتھ میں لیے بستر پر پہنچ گیا اور اطمینان کا ایک لمبا سانس لے کر کتاب کی طرف متوجہ ہوا۔ جیسے ہی اس نے پہلا ورق الٹا، اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ چیختے ہوئے سبز رنگ کی دھاریوں جیسی عبارت میں لکھا تھا:

”السان ساز مشین ماڈل نمبر ۳۔ یہ مشین صرف گیارہ اور اوتیرہ سال کے درمیان عمر والے بچوں کے استعمال کے لیے ہے۔ یہ مشین ماڈل نمبر ۱ اور ماڈل نمبر ۲ سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اس کی مدد سے گیارہ اور تیرہ سال کے درمیان عمر والے بچے بڑی آسانی سے ایک مکمل اور جیتا جاگتا انسان تیار کر سکتے ہیں۔ اس مشین کے ساتھ دو تحلیلی مشینیں بھی فراہم کی جاتی ہیں تاکہ اس مشین سے بار بار کام لیا جاسکے، تاہم ماڈل نمبر ۱ اور نمبر ۲ کی طرح اس ماڈل میں بھی بہتر یہی ہے کہ تحلیلی مشینوں سے کام ہمارے نگران کی موجودگی میں لیا جائے اور اس کی امداد سے تحلیل عمل انجام دیا جائے۔ مشین کی دوبارہ بھرائی اور فالتو پرزے کے لیے اس پتے سے رجوع کیجئے: انسان ساز کمپنی، ۹۲۸۰۔ سطح افقی، گلنڈ سٹی۔ اوہائیو۔ یاد رکھیے صرف انسان ساز مشین کی مدد سے ہی آپ انسان تیار کر سکتے ہیں۔“

سام ویبر نے حیرت سے اپنی آنکھیں جھپکائیں اور پھر اپنے بدن میں چمکیاں لیں کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا، لیکن وہ خواب نہیں، عالم بیداری میں تھا۔ بکس اس کے سامنے فرش پر پڑا تھا۔ کتاب اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں تھی اور صفحے پر وہی عبارت تھی جو وہ پڑھ چکا تھا ”یاد رکھیے! صرف انسان ساز مشین

کی مدد سے ہی آپ انسان تیار کر سکتے ہیں“

سام ویبر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ورق الٹا۔ دوسرے صفحے پر دوبارہ بھرائی اور فالتو پرزوں کی قیمتیں درج تھیں۔ ان کے نیچے انسان ساز مشین ماڈل نمبر ۳ کا اشتہار تھا۔ تیسرے صفحے پر فہرست مندرجات تھی۔ سام ویبر نے اپنے کانپتے اور پسینے میں نہاٹے ہوئے ایک ہاتھ سے اپنے پلنگ کا ایک پایہ مضبوطی سے تھام لیا اور فہرست مندرجات پر نظر ڈالی:

باب اول۔ حیاتیاتی کمیاب برائے اطفال۔

باب دوم۔ اندرون خانہ اور بیرون خانہ سادہ جاندار اشیاء تیار کرنا۔

باب سوم۔ بولوں کی دنیا۔

باب چہارم۔ ننھے بچے اور دیگر چھوٹے چھوٹے انسان۔

باب پنجم۔ اپنے اور اپنے دوستوں کے جوڑے یا مشینی تیار کرنا۔

باب ششم۔ انسان سازی کے لیے کیا کچھ درکار ہے؟

باب ہفتم۔ انسان کو مکمل کرنا۔

باب ہشتم۔ انسان کو تحلیل کرنا۔

باب نہم۔ اوقات فرصت کے لیے دلچسپ مشغلہ نئی زندگی کی تیاری۔

سام ویبر نے کتاب واپس بکس میں پھینک دی اور لپک کر آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنے عکس کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ اب تک ویسا ہی تھا، گو اس کی رنگت ضرور کچھ اڑی اڑی سی تھی۔ ایک بار پھر وہ حیران ہو کر سوچنے لگا کہ کس شخص نے اس کے ساتھ یہ دلچسپ مذاق کیا ہے؟ کون ایسے دماغ کا مالک ہے جو عملی طور پر مذاق کرنے کے لیے اس حیرت انگیز حد تک جا سکتا ہے؟

خالہ میگی؟ لیوناٹ؟ ٹائٹا؟

تین نام یکے بعد دیگرے اس کے ذہن میں آئے۔ خالہ میگی اس فلیٹ کی مالکہ تھی جس میں سام ویبر نے سکونت اختیار کر رکھی تھی۔ لیوناٹ اس کے دفتر کا ساتھی تھا اور اسی کی طرح وکیل۔ اس دفتر میں ان دونوں کے علاوہ چھ وکیل اور کام کرتے تھے۔ ٹائٹا ان آٹھ وکیلوں کی اکلوتی سیکرٹری تھی، لیکن خالہ میگی کی طرف سے اسے کرسمس کا تحفہ پہلے ہی موصول ہو چکا تھا۔ یہ تحفہ سُرخ اور نیلے رنگ کی چار خوبصورت ٹائٹلوں کی صورت میں تھا اور سام



ویبر گزشتہ دن سے اس سوچ میں تھا کہ جواب میں خالہ میگی کی خدمت میں کیا چیز پیش کرے۔ اس کا ساتھی لیونا ٹٹ اس ذہانت کا مالک یقیناً نہیں تھا جو اس بکس کا سامان تیار کرنے کے لیے درکار تھی اور ٹائٹاگوں خوبصورت ہونے کے ساتھ ذہین بھی تھی، لیکن اس سے ایسے حیرت انگیز مذاق کی توقع پھر بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔

سام ویبر نے ایک بار پھر سونے کا کارڈ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس پر بھیجنے والے کا نام کہیں درج نہ تھا۔ اُسے اس کارڈ کے خالص سونے کا ہونے کے بارے میں سو فیصد یقین تھا اور ظاہر ہے کہ محض مذاق میں کوئی شخص اسے سونے کا کارڈ نہیں بھیج سکتا اور پھر بات اتنی ہی تو نہیں تھی۔

”وکر سمس سال ۲۱۷۱ مبارک!“

کارڈ پر لکھی ہوئی یہ تحریر بے حد الجھن میں ڈالنے والی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ ۲۱۷۱ء میں انسانیت کس مقام پر پہنچ چکی ہوگی؟ شاید اس وقت انسان ستاروں تک، بلکہ اس سے بھی آگے پہنچ چکا ہوگا۔ شاید اس وقت انسان اسی طرح بونے تیار کرے گا جو اس کے سب کام انجام دیا کریں اور پچوس کہیے۔۔۔

یہ سوچتے سوچتے اُسے خیال آیا کہ ممکن ہے کہ بکس کے اندر کوئی اور تحریر موجود ہو جس سے کچھ سراغ مل سکے۔ سام ویبر اس بکس میں پڑی ہوئی اشیاء نکالنے کے لیے جھکا۔ اچانک اس کی نظریں ایک بڑے سے شیشے پر پڑیں۔ اس کے اندر مٹیالے رنگ کا کوئی سفوف تھا اور اس پر کوئی لیبل لگا تھا۔

”خشک نیورون مرکب، صرف انسان سازی کے لیے“ سام ویبر ایک دم ہی بچھے ہٹ گیا اور بول اٹھا: ”بند ہو جاؤ،“ بکس فوراً بند ہو گیا۔ سام ویبر نے اطمینان کا سانس لیا اور تیزی سے پھلانگ لگا کر بستر میں گھس گیا۔



اگلی صبح جب لیونا ٹٹ دفتر میں آیا تو سام ویبر نے اس کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھا۔ لیوایسی طبیعت کا آدمی ہی نہ تھا جو کسی مذاق کو زیادہ دیر تک اپنے سینے میں محفوظ رکھ سکے، لیکن وہ آتے ہی اخبار دیکھنے میں غمو ہو گیا اور دو تین گھنٹے اخبار میں کھویا رہا۔ سام ویبر کو اپنے دوسرے ساتھی بھی اپنی اپنی مصروفیتوں میں الجھے نظر آئے۔ کسی کے دماغ میں بھی انسان ساز مشین کے خیال کا ہلکا سا شائبہ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

دس بجے ٹائٹا دفتر میں آئی۔ اس نے اپنے آٹھ آقاؤں کو ایک بھر پور مسکراہٹ کے ساتھ گڈ مارنگ کہا اور پھر لیونا ٹٹ کی میز پر جھک کر اس روز کے کام کے بارے میں پوچھا۔ سام ویبر غصے سے بل کھا کر رہ گیا۔ اصولی طور پر ٹائٹا تمام وکیلوں کی مشترکہ سیکرٹری تھی، لیکن اس کی توجہ کا بیشتر حصہ لیونا ٹٹ کے لیے وقف تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ آٹھوں وکیلوں میں سب سے دلچسپ واقعہ ہوا تھا۔

پرنس کے وقفے سے ذرا پہلے ٹائٹا شاڈر رسمی طور پر سام ویبر کے قریب آئی اور کہنے لگی۔ ”مجھے خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ آج آپ اتنے مصروف ہوں گے۔“

سام ویبر نے قانون کی بھاری کتاب ایک طرف رکھ دی اور قدرے تلخی سے جواب دیا۔

”تمہارا خیال درست نہیں مس ٹائٹا، میں بڑی دیر سے تمہارے فارغ ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔ خیال تھا کہ تم فارغ ہو جاؤ تو تھوڑا سا کام کر لیا جلتے۔“

ٹائٹا نے حیرت سے سام ویبر کی طرف دیکھا۔ ”لیکن آج تو پیر نہیں ہے۔ میسرز سمرسٹ اینڈ وجیک کے ہاں سے تو کام آپ کو پیر کے دن ہی موصول ہوتا ہے۔“ سام ویبر نے آہستہ سے کہا: ”مجھے ایک خط لکھوانا ہے مس ٹام، جب بھی تمہیں اس کے لیے ضروری سامان مل جائے، آجانا۔“

ٹائٹا حیرانی سے سام ویبر کی طرف دیکھتے ہوئے گئی اور کاپی پنسل لے آئی۔ سام ویبر ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا اور پھر اس نے لکھوانا شروع کیا۔

باضابط عنوان، آج کی تاریخ اور چیئرمین آف کامرس، گنٹ سٹی اوہائیو کے نام: ”وہ ذرا دیر کے لیے رکا اور پھر اُس نے جیسے ایک ہی سانس میں خط کا مضمون لکھوا دیا۔“

”جناب من! کیا آپ براہ کرم مجھے اس امر سے مطلع فرمائیں۔ گے کہ آپ نے حال ہی میں انسان ساز کمپنی یا اس سے ملتے جلتے نام کی کوئی کمپنی رجسٹرڈ کی ہے؟ میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ اس نام کی یا اس سے ملتے جلتے نام کی کوئی کمپنی آپ کے ادارے میں شامل ہونے کا ارادہ رکھتی ہے؟ میں یہ تحقیقات اپنے موکل کے جانب سے کر رہا ہوں جسے اس کمپنی کے تیار کردہ مصنوعات میں سے ایک سے دلچسپی ہے۔ میرا موکل آپ

کے شہر کی سطح افقی یا شارع افقی نام کی سڑک پہنچتا ہے میں اس امر سے بھی آگاہی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں اگر آپ ان اداروں کے نام اور پتے مہیا کریں جو اس سڑک پر کام کر رہے ہیں تو عین نوازش ہوگی۔

ٹائٹل نے خط لکھ کر مسرت بھری آنکھوں سے سام ویر کی طرف دیکھا اور قدرے جوش سے کہنے لگی۔

”ادہ سام! آپ کو ایک اور موکل مل گیا۔ مجھے بہت خوشی ہے۔ دیکھنے میں تو وہ خاصا خوفناک نظر آتا ہے، لیکن مجھے یقین ہے۔“

”کون؟“ سام ویر نے ایک دم ٹوک کر کہا، ”کون خوفناک نظر آتا تھا؟“

”آپ کا موکل اور کون؟“ ٹائٹل نے جواب دیا، ”آج جب میں دفتر آئی تو ایک لمبا ترنگا بوڑھا آدمی لمبا اور کوٹ پہنے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ لفٹ آپریشن نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس بوڑھے سے کہا۔ یہ مسٹر ویر کی سیکرٹری ہیں۔ یہ آپ کو ان کے متعلق وہ سب کچھ بتا سکیں گی جو آپ جاننا چاہتے ہیں۔ پھر اس بوڑھے نے گھور کر میری طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں اس قدر خوفناک تھیں کہ میں بے چینی سی ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ آپ کے متعلق کچھ پوچھ گا۔ لیکن وہ بڑبڑانے لگا، ”سب بے ترتیب اور الٹ پلٹ شخصیتیں ہیں۔ کوئی نارمل نہیں، کوئی متوازی نہیں،“ اور پھر وہ ایک طرف چلا گیا۔ اس کا یہ رویہ بظاہر بڑا ہی غیر شائستہ تھا، تاہم اگر وہی آپ کا نیا موکل ہے تو میں معلوم کر کے بتا دوں گی۔“

اتنا کہہ کر ٹائٹل نے ایک طویل سانس لیا اور سام سوچنے لگا کہ وہ لمبا ترنگا بوڑھا کون ہو سکتا ہے۔ کہیں اس کا تعلق بھی اس پر اسرار تحفے سے تو نہیں؟ وہ اٹھ کھڑا ہوا، ”میں گھر جا رہا ہوں کوئی ضروری کام آجائے تو مجھے بلا لینا۔“

گھونچ کر سام ویر نے پہلے منہ ہاتھ دھویا، پھر اس بکس کے سامنے کھڑا ہوا جو اب تک اس کے ذہن پر مسلط تھا، ”کھل جاؤ“ اس نے حکم دیا اور بکس کھل گیا۔ کتاب بکس کے اندر اسی طرح کھلی تھی۔ تھی جس طرح اس نے پھینکی تھی۔ اس کا کچھ حصہ ایک اور چیز کے خانے میں جا پڑا تھا۔ سام ویر نے دونوں کو باہر نکال لیا۔ اس نے کتاب ایک طرف رکھ کر اس دوسری چیز کی طرف دیکھا یہ تارلا ٹیوبوں اور دو دربینوں کا ایک عجیب سا مجموعہ تھا۔ اس کے ایک طرف اسی طرح کے سبز پر اسرار حروف میں لکھا تھا ”الیکٹرونی“

تور دہلیں اور دو بینوں بنج، اس نے احتیاط سے اس وکر بنج کو فرش پر رکھا اور پھر ایک ایک کر کے بکس میں سے ایک چیز نکالنی شروع کی۔ بکس میں مختلف رنگوں کی شیشوں کی پانچ قطاریں تھیں۔ اس کی اندرونی دیواروں کے ساتھ نہایت عجیب و غریب پتلی سی چادریں لگی تھیں۔ ان چادروں کو کناروں پر سے دبایا جائے تو وہ مختلف انسانی اعضاء کی شکل اختیار کر لیتی تھیں جن کی شکل اور سائز ان کے کسی حصے میں سوراخ کر کے تبدیل کیا جاسکتا تھا۔

سام ویر نے سامان اسی حالت میں پڑا رہنے دیا اور کتاب اٹھا کر اس کے پہلے باب کا مطالعہ کرنے لگا۔ یہ باب ”حیاتیاتی کیما براٹے اطفال“ تھا۔ رات کے نو بجے تک سام کتاب پڑھنے میں لگا

رہا اور پھر اٹھ کر الیکٹرونی مشین اور وکر بنج، کی طرف آیا۔ ڈرتے ڈرتے اُس نے چند چھوٹی چھوٹی شیشیاں کھولیں۔ کوئی پونے گھنٹے بعد وہ پہلی جاندار چیز تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن یہ محض ایک جاندار سیما مادہ تھا جو بیس منٹ زندہ رہنے کا کے بعد ختم ہو گیا، تاہم وہ خوش تھا کہ اس نے ابتدائی مرحلے طے کر لیا ہے، چنانچہ کھانا کھانے کے بعد اس نے کئی اور ذرا بڑے جاندار مادے تیار کیے، لیکن یہ مادے صرف آدھ گھنٹے سے ایک گھنٹے تک زندہ رہ سکے۔ اگلی صبح اس نے ایک قریبی دکان سے اپنے دفتر فون کیا۔ ٹائٹل نے فون رسیو کیا۔

”آج سارا دن میں گھر پر ہی رہوں گا“ سام نے کہا۔ اس طرح ہفتہ اور اتوار دو دن اس کے پاس تھے اور وہ ان دو دنوں میں انسان سازی کی طرف خاصی توجہ دے سکتا تھا۔ سب سے پہلے اس نے بونے تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ بظاہر اس کتاب کی ہدایت کے مطابق کل کرتے جانا بڑا آسان نظر آتا تھا، لیکن سام ویر تین چار بار ناکام رہنے کے بعد کہیں اتوار کی دوپہر کو ایک بونا تیار کر سکا۔ یہ بونا بھی عجیب و غریب تھا۔ لمبے لمبے بازو جن میں ایک بازو کی لمبائی دوسرے سے زیادہ تھی۔ بغیر ناک یا آنکھوں کے کدو کی طرح گول مٹول سر اور دھڑ۔ ٹانگیں ندارد۔ یہ بونا اس کے بستر پر پڑا تھا۔ اس کے بازو ہل رہے تھے اور اس کا منہ کھلا تھا۔ اس کے سارے جسم میں اور کہیں سوراخ نہ تھا۔ اس بونے کو کھانا کھانے اور رفع حاجت کے لیے وہی ایک منہ استعمال کرنا تھا۔ سام ویر نے سوچا ایسی بد صورت اور بے ڈھنگی

زندگی بھی کیا زندگی ہوگی۔ اس نے بونے کو تحلیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سے پہلے سام ویر اپنے تیار کردہ چھوٹے چھوٹے جاندار مادوں کو تحلیلی مشین کے ذریعے تحلیل کر چکا تھا لیکن وہ تحلیلی مشین چھوٹی تھی۔ بونے کا قدرتیں فطرت کے ذریعہ تھیں۔ اس کے لیے اُسے بڑی مشین استعمال کرنی تھی۔ اس نے بڑی مشین اٹھائی۔ اس کے ایک طرف لکھا تھا۔ تحلیلی مشین سے کام ہمارے نگران کی موجودگی میں انجام دیا جائے۔

سام ویر نے سوچا کمپنی کے نگران کو اب کوئی کہاں جا کر ڈھونڈے۔ میں نے چھوٹی مشین سے کام لیا ہے، بڑی مشین بھی یقیناً چھوٹی مشین کے اصول پر کام کرتی ہوگی۔ اس نے مشین کو فرش پر رکھ کر اس کا فوکس درست کیا اور پانچ منٹ بعد اس کے بستر پر بونے کی جگہ ایک چمکدار سیال مادہ پڑا تھا۔ بونے کو تحلیل اور اس کے اجزا الگ کرتے ہوئے سام ویر نے محسوس کیا کہ واقعی اس بڑی تحلیلی مشین سے کام کمپنی کے نگران کی موجودگی میں لینا چاہیئے۔ تحلیل کے اس عمل میں اس کے بستر کی چادر کا ستیاناس ہو گیا تھا۔

\*\*\*

پیر کے دن دفتر پہنچتے ہی اس پر سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔

”یہ دو دن کیا کرتے رہے ہو تم؟ لیونا ٹنٹ نے پوچھا، یوں لگتا ہے جیسے یہ دو دن تم نے سرک پر چھابڑی لگاتے گزارے ہیں۔“

”میں ایک کتاب لکھ رہا ہوں،“ سام ویر نے جواب دیا۔

”کوئی قانونی کتاب؟ لیونا ٹنٹ نے کہا۔“

”نہیں۔ بچوں کے بارے میں،“ سام ویر نے جواب میں کہا۔ اور پھر ٹانٹا ٹاک لے آئی۔ ایک خط ایسا بھی تھا جسے دیکھتے ہی سام ویر کا دل یکبارگی یوں زور سے اچھلا جیسے ایک دم باہر آجائے گا۔ اس پر گلنٹ سٹی اوپائیو کی مہر تھی۔ لکھا تھا۔ جناب من:

اس وقت گلنٹ سٹی میں انسان ساز کمپنی یا اس سے ملنے جلتے نام کی کوئی کمپنی نہیں ہے اور نہ ہمیں اس بات کا علم ہے کہ اس نام کی یا اس سے ملنے جلتے نام کی کوئی کمپنی ہمارے ادارے میں شامل ہونے کا ارادہ کر رہی ہے۔ ہمارے ہاں اُنفی

سطح یا افقی شارع نام کی بھی کوئی سڑک نہیں ہے۔ ہماری سڑکوں کے نام شمالی جنوبی اطراف میں انڈین قبائل کے نام پر ہیں اور او مشرقی سڑکی اطراف کی سڑکیں ناموں کی بجائے پانچ ہندسوں کے اعداد پر مشتمل ہیں۔

گلنٹ سٹی اس وقت خالصتاً رہائشی آبادی ہے اور ہم اسے اسی طرح قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ یہاں صرف چھوٹی چھوٹی دکانیں اور ہوٹل وغیرہ ہیں۔ اگر آپ یہاں اپنے لیے مکان تعمیر کرنا چاہیں اور آپ اپنے پندرہ پشتوں سے ماں اور باپ دونوں کی طرف سے سفید فام مسیحی اینگلو سیکسن ہونے کا ثبوت فراہم کر سکیں تو ہم آپ کو اس سلسلے میں مزید معلومات بخوشی مہیا کر سکتے ہیں۔ نام تھا مس ایچ پلیٹیفنٹ میئر۔

”تو یہ بات ہے؟“ سام ویر نے اپنے جی میں کہا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ان شیشوں کو دوبارہ نہیں بھروا سکتا، خواہ اس کی قیمت ادا کرنے کے لیے کتنی ہی رقم ہو۔ دوسرے الفاظ میں مجھے اس بکس کے اندر موجود سامان کو بڑی احتیاط اور کفایت سے استعمال کرنا ہوگا، لیکن تحلیل کرنے کا کام بالکل نہیں کر سکتا۔ بڑی طرہی کھیر ہے۔

وہ سوچنے لگا کیا انسان ساز کمپنی مستقبل میں کسی وقت گلنٹ سٹی میں اپنا کاروبار شروع کرے گی جبکہ یہ شہر ترقی کر کے ایک صنعتی شہر بن چکا ہوگا یا یہ بکس وقت کے دریا میں بہتا ہوا غلطی سے راستہ بھول کر میرے پاس آ گیا ہے؟ دونوں کے درمیان یقیناً کوئی تعلق، کوئی رابطہ ہوگا، ورنہ دونوں کی زبان ایک ہی کیسے ہو سکتی ہے؟ اور پھر آخر تحفے کا کوئی مقصد بھی تو ہوگا۔

ٹانٹا اس سے کچھ دریافت کر رہی تھی۔ سام ویر اپنے خیالات کو ذہن سے جھٹک کر اس کی طرف متوجہ ہوا، اگر آپ اب بھی یہی چاہتے ہیں۔ مسٹر سام کو سال نو کے جشن میں، میں آپ کے ساتھ چلوں تو میں لیونا ٹنٹ سے معذرت کیے لیتی ہوں کہ مجھے اپنی والدہ کے پاس جانا ہے اور میں کہیں اور نہیں جاسکتی۔“

سام ویر کو یاد آیا کہ اُس نے کئی دن پہلے، کمر سمس سے بھی پہلے، ٹانٹا سے سال نو کی تقریب ایک ساتھ منانے کا وعدہ لے رکھا تھا۔ اس وقت وہ دل سے یہی چاہتا تھا کہ ٹانٹا اس کے ساتھ ہو، لیکن اس نے کہا۔

”شکریہ ٹانٹا میں اس تقریب میں نہیں جاسکوں گا۔“

مجھے گھر پر کام ہے اور یوں بھی تمہارا جوڑ میرے ساتھ نہیں، لیونائٹ کے ساتھ ہی خوب ہے،

سام و میر کی طرح لیونائٹ ہوتا تو کبھی ایسے الفاظ نہ کہتا۔ جب تک لیونائٹ سامنے نہیں آیا تھا، تب تک سام و میر اور ٹائٹا ہی محفلوں اور پارٹیوں میں اکٹھے دیکھے جاتے تھے۔ باقی افراد دائرۃ ال کے راستے سے ہٹ گئے تھے، لیکن پھر لیونائٹ نے جیسے ٹائٹا کو اس سے ہتھیلیا لینے کا تہیہ کر لیا تھا اور تقریباً ہتھیلیا چکا تھا۔

سام و میر کے لیے یہ احساس بڑا ہی تکلیف دہ تھا۔ کچھ یہ بات نہیں کہ ٹائٹا غیر معمولی طور پر حسین یا غیر معمولی اوصاف کی مالک تھی۔ وہ ذہنی اور معاشرتی طور پر کچھ اچھا سا تھی ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر بھی سام و میر اسے چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، گھومنے پھرنے میں اُسے لطف آتا تھا۔ اُسے اپنے ماں باپ اچھی طرح یاد تھے جو ایک حادثے میں ہلاک ہو چکے تھے۔ نظریاتی طور پر وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اچھے رفیق ثابت نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے باوجود اُن دونوں کی زندگی مسرتوں سے بھر پور تھی۔

اگلی رات وہ کتاب کا پانچواں باب پڑھتے ہوئے اپنے اور ٹائٹا کے متعلق سوچ رہا تھا۔ یہ باب اپنے اور اپنے دوستوں کے جوڑے یا مثنی تیار کرنے کے متعلق تھا۔ اس نے سوچا اگر ٹائٹا کا جوڑا تیار کر لیا جائے تو کیسا رہے۔

”بہت خوب رہے گا“ اس کے دل نے خود ہی جواب دیا۔

”ایک میرے لیے اور ایک لیونائٹ کے لیے“ اندیشہ صرف اس بات کا تھا کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ اس کا تیار کردہ بوناخو فناک حد تک نامکمل تھا۔ اس کے بازو غیر یکساں تھے۔ چہرہ سرے سے غائب تھا اور ٹانگیں موجود ہی نہیں تھیں۔ اگر اسی قسم کا حلیہ ٹائٹا کا تیار ہو جاتا۔ تو وہ اُسے تحلیل کرنے کی بھی جرأت نہیں کر سکے گا۔ اور وہ دنیا والوں کے لیے اور خود اپنے لیے ایک ناقابل برداشت بوجھ بن کر رہ جائے گی۔

اور پھر کتاب میں تنبیہ کے طور پر یہ الفاظ بھی درج تھے۔ یاد رکھیے، آپ کا تیار کردہ مثنی اگرچہ ہر ظاہری تفصیل کے لحاظ سے آپ کے مماثل ہوگا، تاہم اس میں وہ بالغ ذہنی موجود نہیں ہوگی جو مسلسل ایک عمر گزارنے کے بعد آپ کو حاصل ہے۔

وہ ذہنی طور پر اتنا ثابت قدم اور مستقل مزاج بھی نہیں ہوگا، اس میں مشکل اور غیر معمولی صورت حال سے عہدہ بردار ہونے کی صلاحیت بھی اتنی نہیں ہوگی۔ اور وہ اعصاب زدگی کا بھی آسانی سے شکار ہو سکتا ہے۔ صرف ایک ماہر اور پیشہ ور انسان ساز ہی بہترین آلات کے استعمال کے ساتھ کسی انسان کا صد فی صد مثنی تیار کر سکتا ہے۔ آپ کا تیار کردہ مثنی زندہ رہ سکے گا اور اولاد بھی پیدا کر سکے گا۔

سام و میر نے سوچا قسمت آزمائی کر ہی لینی چاہیئے۔ ٹائٹا میں مستقل مزاجی اگر قھوڑی سی اور کم ہوگئی تو کسی کو اس کا کیا پتہ چلے گا۔ بلکہ کئی لحاظ سے تو یہ اچھی بات ہوگی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ سام نے دروازہ کھولا۔ باہر اس کی مالکہ مکان موجود تھی۔ سام اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے بال میں آگیا اور حیرت سے مالکہ مکان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا:

”آپ کسی تقریب میں جا رہی ہیں خالہ میگی؟“

”ہاں“ خالہ میگی نے جواب دیا۔ ”میری بہن اور اس کا شوہر سپرنگ فیلڈ سے آئے ہوئے ہیں۔ میں ان کے ساتھ سال نو کی تقریب میں جا رہی ہوں۔ کم از کم ہمارا پر وگرام ہی تھا۔“

”تھا؟“ سام نے حیرانی سے کہا، ”کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے کیا؟“

”بات یہ ہے میری بہن کی ایک چھوٹی سی بچی ہے۔ اسے ہم تقریب میں ساتھ تولے جا نہیں سکتے۔ میں نے ایک لڑکی کا بندوبست کیا تھا وہ ہماری واپسی تک اس بچی کو سنبھالے رکھے۔ لیکن ابھی اس لڑکی کا فون آیا ہے کہ اس کی اپنی طبیعت ٹھیک نہیں۔ سو جب تک کوئی اس بچی کو سنبھالنے والا نہ ہو، تقریب میں نہیں جاسکتے۔“

سام و میر کے ذہن میں فوراً کتاب کے باب چہارم کا خیال دوڑ گیا۔ بونا بنانے سے تو شدید غلطی ہوگئی تھی، لیکن ایک بچی کا مثنی تیار کرنا کچھ ایسا مشکل نہیں۔ اس نے کہا۔

”آپ بڑے شوق سے تقریب میں جائیں خالہ بچی کو میں سنبھال لوں گا۔ میں فارغ ہوں اور کہیں نہیں جا رہا،“

خالہ میگی اُسے نچلی مٹرل میں لے آئی۔ خالہ کی بہن نے اُسے بچے کی نگہداشت کے متعلق ہدایات دیتے ہوئے کہا۔ ”بچی صرف اس وقت آہستہ آہستہ روتی ہے جب اسے پیشاب کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے اگر آپ جلدی کریں گے، آپ کا بستر خراب ہونے سے بچ جائے گا۔“

”آپ فکر نہ کریں،“ سام دبیر نے جواب دیا، ”میں انتہائی عجلت سے کام لوں گا۔ پتا چل جانا شرط ہے۔“

سام دبیر انہیں چھوڑنے کے لیے دروازے تک آیا، دروازے پر خالہ میگی نے کہا۔

”اوہ مجھے بتانا یاد نہیں رہا مسٹر سام! آج سہ پہر ایک شخص آپ سے ملنے آیا تھا۔“

کیا وہ اور کوٹ پہنے ہوئے لمبا ترنگا بوڑھا تو نہیں تھا؟  
”ہاں اس کی نظریں بڑی خوفناک تھیں اور وہ بڑبڑاتے ہوئے بات کرتا تھا۔ کیا آپ اُسے جانتے ہیں؟“  
”نہیں تو کیا چاہتا تھا وہ؟“

”وہ دریافت کر رہا تھا کہ کیا یہاں ساؤیلوینا اکا کوئی شخص رہتا ہے جو وکیل ہے اور گوشہ ایک ہفتے سے اپنا بیشتر وقت اپنے کمرے میں گزار رہا ہے؟ میں نے اُسے جواب دیا تھا کہ یہاں تو سام دبیر رہتا ہے۔ سام ویلور کو تو یہاں سے گئے کوئی ایک سال ہو گیا ہے۔ یہ سن کر اس نے چند لمحے میری طرف دیکھا اور بکھر بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگا، ”ویلور، دبیر۔ شاید ان سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔“ اور پھر وہ خدا حافظ کہے بغیر یا مجھ سے معذرت کہے بغیر چلا گیا۔ کم از کم اس کا رویہ بڑا ہی غیر شائستہ تھا۔

﴿﴾

خالہ میگی اور اس کی ہمیشہ کے چلے جانے کے بعد سام دبیر کچھ سوچتا ہوتا بچے کے بستر کے قریب آیا۔ اس کا ذہن اس لمبے ترنگے بوڑھے کے بارے میں سوچ رہا تھا جو دوبارہ اس سے ملنے آچکا تھا۔ سام کو یقین تھا کہ اس بوڑھے اور انسان ساز مشین کے تحفے کے درمیان کوئی تعلق ضرور ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بوڑھے کو سام دبیر کی جستجو تو ہے، لیکن وہ اس کی شخصیت کے متعلق تمام شکوک و شبہات دور کر کے پھر اس سے ملنے کا آرزو مند ہے۔

وہ تیسری منزل پر اپنے کمرے میں گیا اور یکس میں چھوٹا حیاتی قطرنگا رکھا لایا۔ یہ جسم کے اعضاء کی صحیح صحیح پیمائش اور جسمانی اعضاء کی صحیح صحیح مقدار معلوم کرنے کی مشین تھی۔ سام نے کتاب کھول کر پاس رکھ لی اور مشین کو بستر کے قریب رکھ کر اس کا دوسرا سربچے کے تنگے بدن پر لگا دیا۔ مشین چل پڑی اور ایک چھوٹا سا رولز بچی کے جسم پر پھرتے ہوئے تمام ضروری پیمائش لینے لگا۔ ٹھوڑی ہی دیر بعد بچی کے حیاتیاتی اور عضویاتی کوائف کی مکمل

تفصیل اس کے سامنے موجود تھی۔ یہ کوائف اتنے جامع اور مفصل تھے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا اکیڑ بھی اپنی ساری ذہانت اور مہارت سے کام لے کر اس کا دسواں حصہ ہم نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اب اس کے سامنے اپنے کام کا ایک خاکہ موجود تھا۔ اس نے محو خواب بچے کو دہلیں چھوڑا اور اپنی مشین اور کتاب سمیت اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ سارے اعداد و شمار اس کے سامنے تھے۔ کمرے میں پہنچتے ہی اس نے کام کا آغاز کر دیا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد بچی کا مثلی اس کی آنکھوں کے سامنے موجود تھا۔ وہ ایک جیتی جاگتی بچی کو عالم وجود میں لے آیا تھا۔ جوشن مسرت سے اس نے اپنی تیار کردہ بچی کو اٹھایا اور پچلی منزل میں اصلی بچی کے ساتھ لٹا دیا۔ دونوں میں ذرا فرق نہ تھا۔ اگر تھا تو صرف اتنا تھا کہ اصل بچے کے بال سنہری تھے اور اس کی تیار کردہ بچی کے سرخ۔ شاید حساب میں یا مشین میں مطلوبہ اشیاء ڈالتے وقت تھوڑی بہت غلطی ہو گئی تھی۔ تاہم اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔

کامیابی کے جوش سے سرشار سام دبیر دیر تک اپنی تخلیق کو دیکھتا اور اس کا موازنہ اصل بچی سے کرتا رہا۔ پھر اس نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ باہر بج رہے تھے اس نے سوچا خالہ میگی اور اس کی بہن کی واپسی سے پہلے پہلے بچی کی تخلیق کے تمام آثار و شواہد مٹا دینے چاہئیں۔ ورنہ دوسری بچی کو دیکھ کر خالہ میگی اور اس کی بہن جو سوالات کریں گی ان کا جواب دینا اور انہیں مطمئن کرنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا اس نے کچھ سوچ کر بچی کو کپڑے میں لپیٹا اور گتے کے ایک ڈبے میں ڈال دیا۔ ڈبا بغل میں دبائے وہ باہر سڑک پر نکل آیا اور سڑک پار کر کے تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ بچی کو جھکانے لگانے کی کوئی واضح صورت اس کے ذہن میں نہیں تھی، لیکن اگلے ہی چوک میں ایک عمارت کے دروازے پر ”دارالاطفال“ کا بورڈ لگا دیکھ کر اس کے قدم رک گئے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ سڑک تقریباً ویران تھا۔ اُس نے ڈبے کے ایک کونے پر چھوٹے چھوٹے حروف میں لکھا،

”براہ کرم میری بچی کی حفاظت کیجئے۔“ میں ابھی غیر شادی

شدہ ہوں۔“

پھر اس نے ڈبا دروازے پر رکھ کر گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ جتنی دیر میں عمارت کا دروازہ کھلا، وہ دوبارہ سڑک پار کر کے اپنے گھر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ گھر پہنچ کر اُسے بچی کی ناف کا خیال آیا۔ اس نے بچی ناف کے بغیر ہی تیار کر ڈالی تھی۔ شاید دارالاطفال والوں کو اس سلسلے میں کچھ چیر بھاڑ کرنی پڑے۔ نہ جانے بچی کو کپڑے میں سے کھولنے کے بعد ان کا اولین تاثر کیا

ہوگا۔



یہ نئے سال کی دوسری تاریخ تھی۔ دفتر پر بلا کی خاموشی طاری تھی۔ سام ویر کتاب کے آخری صفحات میں کھویا ہوا تھا۔ جب اسے اپنے قریب دو افراد کی موجودگی کا احساس ہوا، اس نے بے دلی سے کتاب پر سے نظریں ہٹا کر دیکھا۔ ٹائٹا اور لیو نائٹ اس کے قریب کھڑے تھے۔ سام نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ دونوں اس سے کچھ فاصلے پر تھے اور کتاب کے صفحات پر ان کی نظر نہیں پڑی تھی، ورنہ انہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ کیسی عجیب چیز پڑھ رہا ہے۔

سام ویر نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ٹائٹا کی تیسری انگلی میں ایک خوبصورت طلائی انگوٹھی چمک رہی تھی اور لیو نائٹ کچھ جھینپ سا رہا تھا۔ ٹائٹا کہنے لگی۔  
مسٹر سام، بڑا مزہ رہا کل شام۔ ایسی حیرت انگیز اور پُرسرت تقریب آج تک میری زندگی میں نہیں آئی۔ اور آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ہم۔ ہم۔۔۔۔۔

”شادی کر رہے ہیں“ لیو نائٹ نے بات مکمل کی۔

”مبارک ہو! سام ویر کی زبان سے نکلا، لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے ایک خنجر اس کے سینے میں اتر گیا ہے۔

”تمہیں شاید حیرانی ہوئی ہے یہ سن کر؟“ لیو نائٹ نے کہا۔

”نہیں، بالکل نہیں“ سام نے جواب دیا ”مجھے تو پہلے ہی سے تو معلوم تھا کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہو تمہارا جوڑ ہر لحاظ سے موزوں ہے“ اور پھر وہ اٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

”اچھا اب مجھے اجازت دیجئے۔ مجھے ایک خاص کام انجام دینا ہے۔ ایک خاص تحفہ عروسی“  
”ابھی سے؟“ لیو نائٹ نے حیرانی سے کہا۔

”کیوں نہیں؟“ ٹائٹا نے جواب دیا، ”تحفے کا انتخاب کوئی آسان کام تھوڑی سی ہے، اور پھر سام جیسے خاص دوست سے تو ہمیں توقع بھی حاصل تحفے کی ہوتی چاہیے“

سام نے ٹائٹا کی اس بات کے جواب میں کچھ کہنے کی بجائے کتاب بغل میں دبائی اور خاموشی سے باہر کی طرف بڑھ گیا۔

جب وہ گھر پہنچا تو خالہ میگی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔  
”مسٹر سام! وہ آدمی آج پھر یہاں آیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“  
”کون آدمی؟ وہ لمبا ترنگا بوڑھا؟“

”ہاں کیسا کمزور انسان ہے وہ بھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ مسٹر سام گھر پر نہیں ہیں تو وہ مجھے مجبور کرنے لگا کہ تم مجھے ان کے کمرے میں لے چلو۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ میں مسٹر سام کی اجازت کے بغیر ایسا نہیں کر سکتی۔“  
”کیا وہ پھر آئے گا؟“

”ہاں، اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ مسٹر سام عام طور پر کس وقت واپس آتے ہیں اور میں نے بتا دیا کہ تقریباً آٹھ بجے شام کو، لیکن آپ شاید خود بھی اس سے ملنا پسند نہیں کریں گے۔“  
”شکریہ خالہ! سام ویر نے کہا۔ لیکن جب وہ آئے تو اسے میرے کمرے میں لے آنا۔ اگر وہ اصل مالک سے تو میں اس کی چیز غیر قانونی طور پر اپنے پاس رکھے ہوئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ چیز آئی کہاں سے ہے۔“

اپنے کمرے میں اگر سام ویر نے کتاب ایک طرف رکھی اور بکس کو کھلنے کا حکم دیا۔ بکس کھل گیا تو اس نے اس میں سے چھوٹا حیا تی قطر نگار نکالا۔ یہ مشین کوئی زیادہ جگہ گھیرنے والی نہیں تھی۔ اخبار کا ایک کاغذ اسے لپیٹنے کے لیے بہت تھا۔ چند لمحے بعد سام ویر حیا تی قطر نگار بغل میں دابے واپس اپنے دفتر کی طرف جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا اسے واقعی ٹائٹا کا مٹھی تیار کرنا چاہیئے؟ اس کی تمام کمزوریوں کے باوجود وہ ٹائٹا کو دنیا کی ہر عورت سے زیادہ چاہتا تھا۔ جب اصل ٹائٹا کی شادی لیو نائٹ سے ہو رہی ہے تو ایسا نہ ہو کہ اس کا مٹھی بھی لیو نائٹ سے شادی کرنے پر اصرار کرے۔

سام نے سوچا اگر ایسا ہی ہوا تو پھر وہ کیا کرے گا، لیکن اس خیال نے اسے تسلی دی کہ ابھی اسے اس اندیشہ میں ڈبلا نہیں ہونا چاہیئے۔ جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔ یہ صورت حال اگر اس کے لیے پریشان کن ثابت ہو سکتی ہے تو خود لیو نائٹ بھی پریشانی کا شکار ہوئے بغیر نہ رہے گا۔ جب ٹائٹا کے دو وجود اس کے ساتھ شادی کے لیے اصرار کریں گے۔ یہ صورت حال خاصی دلچسپ ثابت ہو سکتی ہے۔

تاہم جو خیال اس کے لیے واقعی پریشان کن تھا، وہ ٹائٹا

کوئی اور عورت کمرے کے اندر ہو تو اس کے چلے جانے کا انتظار کرنا۔ جب کمرے میں صرف تم تہا رہ جاؤ تو اپنے کپڑے اتار دینا۔

”کپڑے اتار دینا“ ٹائٹنا خوف زدہ سی ہو گئی۔

”اس میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے ٹائٹنا۔ میں باہر ہی رہوں گا اور کوئی شخص بھی اندر نہیں آئے گا۔“

اس کے بعد سام نے اُسے حیاتی قطرنگار کا طریقہ استعمال سمجھایا۔ ٹائٹنا مشین لے کر کمرے میں گئی اور کوئی پندرہ منٹ بعد واپس آگئی۔ مشین سام کو واپس دیتے ہوئے اس نے مشین کے فیتے کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

”میں نے آج تک ایسی چیز نہیں دیکھی۔ اس فیتے کے مطابق میرے جسم میں آئیوڈین کی مقدار۔۔۔“

”اس بارے میں اپنے دماغ کو بالکل تکلیف نہ دو ٹائٹنا۔“ سام نے جلدی سے مشین کو کاغذ میں لپیٹتے ہوئے کہا۔ یہ ایک قسم کی علامتی تحریر یا کوڈ ہے۔ اس سے مجھے یہ معلوم ہو جائے گا کہ تمہارے لیے تحفہ کس قسم کا، کتنی تعداد میں ایک اور کس سائز میں ہونا چاہیے۔ تم جب تحفہ دیکھو گی تو خوشی سے پاگل ہو جاؤ گی۔“

سام ویبر نے ایک بار پھر فیتے کی طرف دیکھا کہ کہیں پیمائش لیتے ہوئے ٹائٹنا سے کوئی فرگزاشت نہ ہو گئی ہو، لیکن نہیں۔ تمام اندراجات مکمل تھے۔ اس نے کہا۔

”اچھا اب مجھے اپنا کام شروع کرنا ہے۔“

اپنے کمرے میں پہنچتے ہی سام ویبر نے دروازہ بند کر کے اپنا لبکس اتارا، حیاتی قطرنگار پر ایک نیا فیتہ چڑھایا اور اپنے جسم کی پیمائش لینے لگا۔ حیاتی قطرنگار سے فارغ ہو کر اس نے لبکس کو کھلنے کا حکم دیا اور پھر اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ سب سے پہلے پانی کا مسئلہ تھا۔ عام انسانی جسم میں پانی کی مقدار خاصی ہوتی ہے۔ اور پھر اس پانی کو بالکل خاص بھی ہونا چاہیے۔ سام ویبر نے ایک بڑی سی کیتی پانی سے بھر کر اُبلنے کے لیے سٹور پر رکھ دی تاکہ پانی کی کثافتیں دور ہو جائیں۔ کیتی سٹو پر رکھ کر وہ اپنی ضروریات کی چیزیں لبکس سے نکال کر باہر رکھتا گیا تاکہ ہر چیز فوراً ہی اسے مل جائے اور وقت ضائع نہ ہو، اور اس کے بعد وہ کتاب کے باب ششم، ہفتم اور ہشتم کی درق گردانی کرنے لگا جو انسانی جسم کے لیے درکار اشیاء انسان کی تکمیل اور پھر اس

کا مٹی تیار کرنے میں غلطی کا امکان تھا۔ ہو سکتا ہے اس کی تیار کردہ ٹائٹنا کئی معاملات میں اصل ٹائٹنا سے مختلف ہو۔ وہ ابھی کوئی ماہر مٹی ساز نہیں تھا۔ خالہ میگی کی بھانجی کا مٹی اس کے انارٹی پن کا واضح ثبوت تھا، اور اگر ٹائٹنا کا مٹی بھی ایسا ہی ناقص ہو تو وہ عورت ذات سے مرعوبیت کی بنا پر اسے تحلیل کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکے گا۔ اس لحاظ سے ٹائٹنا کا مٹی تیار کرنے سے پہلے اُسے مزید تجربہ حاصل کرنا چاہیئے۔ اس تجربے کے لیے ضروری تھا کہ وہ ایسی ہستی کا مٹی تیار کرے جسے وہ اچھی طرح جانتا ہو۔ کیوں نہ میں اپنا ہی مٹی تیار کروں؟

بجلی کی سی تیزی سے یہ خیال اس کے دماغ میں آیا کیوں نہیں؟ وہ اپنے جسمانی خواص کو ٹائٹنا کے وجود سے کہیں زیادہ بہتر جانتا اور سمجھتا ہے، اور پھر اُسے اس نقلی سام ویبر کو تحلیل کرنے میں بھی کوئی دقت اور الجھن نہیں ہو گی۔ پھر اسی میٹر پر سے ٹائٹنا کا مٹی تیار ہو سکتا ہے۔ اپنے مٹی کی تیاری کا تجربہ ٹائٹنا کی مٹی تیاری میں اس کے کام آئے گا، بلکہ ہو سکتا ہے وہ اس تجربے کی بدولت اصل سے کہیں بہتر ٹائٹنا تیار کرنے میں کامیاب ہو جائے۔



لیوناٹ اور ٹائٹنا نے حیرانی سے اس مشین کی طرف دیکھا جو سام ویبر کے ہاتھ میں تھی۔ لیو نے حیرانی سے کہا:

”کیا ہے یہ؟ مجھے تو کوئی گھاس کاٹنے کی مشین لگتی ہے۔“

”یہ پیمائش کرنے کی مشین ہے۔ اس سے ہمیں اپنے جسم کے لیے لباس اور دیگر چیزوں کا صحیح سائز معلوم ہو جاتا ہے۔ میں آپ لوگوں کے لیے شادی کا تحفہ اُس وقت تک نہیں خرید سکتا جب تک مجھے صحیح صحیح سائز نہ معلوم ہو جائے۔ ٹائٹنا کیا تم ذرا ہال میں چلو گی؟“

ٹائٹنا نے حیرانی سے مشین کی طرف دیکھا: ”اس سے کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی؟“

”نہیں، بالکل نہیں۔“ سام ویبر نے کہا۔ ”میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ یہ تحفہ مسٹر لیو کے لیے شادی کے موقع تک ایک لاز رہے۔“

ہال میں اُس نے ٹائٹنا

کو سمجھاتے ہوئے کہا:

”دیکھو تم اس کمرے میں جاؤ جو خواتین کے لیے مخصوص ہے۔ میں باہر کھڑا رہوں گا اور کسی کو اندر نہیں جانے دوں گا۔ اگر



کی تحلیل کے بارے میں تھے۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی امتحان دینے سے چند منٹ پہلے اپنے ضروری نوٹ دیکھ رہا ہے۔ کتاب میں ذہنی عدم ثبات کے بار بار ذکر سے اُسے وحشت محسوس ہو رہی تھی۔

”اس مشین سے تیار کردہ انسان اپنی انتہائی مکمل صورت میں بھی قرون وسطیٰ کے انسان کے تو ہم پرستانہ رجحانات اور اعصاب زدگیوں کے مالک ہوں گے۔ بالآخر انہیں نارمل شمار نہیں کیا جاسکے گا۔ انہیں نارمل خیال کرنے کی غلطی کبھی نہیں کرنی چاہیے۔“

اُس نے سوچا فکر کی کوئی بات نہیں۔ اپنے مثنیٰ کو تو مجھے بہر حال تحلیل کرنا ہے تاکہ اس میٹرل سے پھر ٹائٹا کا مثنیٰ تیار کر سکوں اور ٹائٹا کے سلسلے میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس نے صحیح سائز کے مطابق ساپے تیار کر کے اپنے بستر پر رکھے اور یکے بعد دیگرے کتاب سے مدد لیتے ہوئے مختلف شیشیاں خالی سانچوں میں خالی کرتا گیا۔ دو گھنٹے تک وہ بری طرح اس کام میں الجھا ہوا۔ ان دو گھنٹوں میں اسے اپنی اہلیت اور مہارت کا وہ اندازہ ہوا جو اسے آج تک نہیں ہو سکا تھا۔ جب اس کا کام ختم ہوا تو بکس کی بیشتر شیشیاں خالی ہو چکی تھیں۔ کتاب ایک طرف پڑی تھی اور بستر پر سام ویر کا پتلا پڑا تھا۔ لیکن ابھی اس میں زندگی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ سام ویر نے زندگی پیدا کرنے والی مشین بستر کے قریب لاکر اس پتلے سے لگا دی۔ مشین چالو ہوئی اور پتلے کے جسم میں حرکت پیدا ہو گئی۔ وہ کھانسا اور پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”آہا! خوب، بہت خوب!“

پھر وہ بستر سے ایک چھلانگ لگا کر تحلیلی مشین کی طرف جھپٹا اور اسے تھوڑا مڑ کر رکھ دیا۔

”میں نہیں چاہتا کہ موت کی یہ تلوار میرے سر پر لگتی رہے۔ ویسے میں چاہتا تو اس مشین کو تم پر بھی استعمال کر سکتا تھا۔“

سام ویر حیرت زدہ رہ گیا۔ بونے اور بچی کی تیاری کے بعد وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا مثنیٰ اپنی زندگی کا خیر مقدم اتنے بھرپور اور پر جوش انداز سے کرے گا۔ وہ فرش پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا:

”یہ تو تم نے بہت برا کیا ہے۔ تم میں وہ ثابت قدمی اور مستقل مزاجی ہی نہیں ہے جس سے تمہیں معاشرے کا ایک نارمل فرد تسلیم کیا جاسکے۔ تم متلون مزاج ہو۔“

”میں متلون مزاج ہوں؟ مجھ میں مستقل مزاجی نہیں ہے؟“

اس کا مثنیٰ کہنے لگا: ”اور ذرا دیکھو تو سہی، یہ بات کہہ کون رہا ہے؟ وہ شخص جس کی ساری بالغ زندگی کھوٹے کھوٹے سے انداز میں بسر ہو رہی ہے جو ایک ایسی عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے جو چند حیاتیاں اکٹھا ہٹوں کے برعکس غلط مجموعے کے سوا اور کچھ نہیں اور جو ہر اس شخص کے قدموں پر جھک سکتی ہے جو صحیح بٹن دبا جانتا ہو، سام ویر نے برا فروختہ ہو کر کہا۔“ اس کی مات مت کرو۔“ اس کے مثنیٰ نے اُس کی طرف دیکھا اور کہا۔

”بہت اچھا، میں اس کا نام چھوڑے دیتا ہوں، لیکن اس کا جسم نہیں۔ سنو سام یا ویر یا جو کچھ بھی تمہارا نام ہے، تم اپنی زندگی بسر کر سکتے ہو اور میں اپنی۔ اگر تم اس بات سے خوش ہو سکو، لیکن جہاں تک ٹائٹا کا تعلق ہے، اب تمہارے پاس اس کا مثنیٰ تیار کرنے کے لیے کوئی سامان نہیں رہا۔ تاہم تمہاری پسند و ناپسند مجھ میں بھی کافی حد تک موجود ہے۔ میں ٹائٹا کو بری طرح چاہتا ہوں اور اسے حاصل بھی کر سکتا ہوں جب کہ تم نہیں کر سکتے۔ تم میں وہ حوصلہ ہی نہیں ہے۔“

سام ویر اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بچھنچ کر غصے سے اٹھا اور اس کی طرف لپکا لیکن پھر اس نے اپنے مقابل کی آنکھوں میں اطمینان کی ایک جھلک دیکھی۔ وہ سوچنے لگا کہ اس لڑائی کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ یہ زیادہ سے زیادہ بغیر ہارجیت کے ختم ہو جائے گی۔ اس نے پھر دلیل کا سہارا لیا۔

”دیکھو،“ وہ کہنے لگا اور کتاب کے مطابق تم کسی وقت بھی اعصاب زدگی کا شکار ہو سکتے ہو۔“

”کتاب! کتاب تو آج سے دو سو سال بعد کے بچوں کے لیے لکھی گئی تھی جن کی نسل کشی بڑی محتاط ہوگی اور جنہیں سائنسی تعلیم وافر حاصل ہوگی۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ میں۔۔۔“

دروازے پر زور کی دھمک ہوئی۔ ”مسٹر ویر!“

”جی!“ ان دونوں نے ایک ساتھ کہا۔ باہر مالک مکان حیران سی رہ گئی اور خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ”وہ آدمی نیچے کھڑا ہے اور آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ کیا میں اسے بتا دوں کہ آپ اپنے کمرے میں تشریف رکھتے ہیں؟“

”ہاں، میں گھر پر نہیں ہوں!“ اس کے مثنیٰ نے کہا۔ ”کہہ دو میں ایک گھنٹہ پہلے یہاں سے چلا گیا تھا!“ سام ویر نے ساتھ ہی کہا۔

باہر خالہ میگی کی ایک اور حیرت بھری چیخ بلند ہوئی اور پھر



## قلمی دوست نہیں، قلمی دوست بنائیں

ہزاروں پاکستانی وغیرہ کی لڑکیوں پر مثل کیسٹاگ

### آدھی ملاقات

شائع ہو گیا ہے، شعر و شاعری، انعامی مقابلہ، ذہنی آزمائش

دلچسپ مضامین کے علاوہ اور بہت کچھ

## اپنی آمدنی میں اضافہ کیجئے

آمدنی میں اضافہ کرنے کے نادر نسخے ہر شخص کیلئے فائدہ مند  
آپ بھی فائدہ اٹھائیے

المعروف بیت بازی

شعر و شاعری پر منفرد کتاب

آپ بھی اپنی پسند کے اشعار، اپنی  
تصویر کے ساتھ شائع کروائیے



## دعا کا شعاع

اہل ذوق اور اعلیٰ ظرف کے لوگوں کیلئے بطور تحفہ شائع ہو گئی ہے

اپنے پیاروں کو دلکش اور معیاری اشعار ارسال کریں

عید کے اشعار کے علاوہ اور دوسرا شعاری

## عید کے دلکش دعا کا شعاع

مصنف

محمود احمد مدنی

شائع ہو گئی ہے -



شائع ہو گئی ہے ایک خط لکھ کر بذریعہ وی پی منگوائیے

منگوانے کا پتہ

ایس پی کارپوریشن، پوسٹ بکس نمبر ۱۲۱، کراچی ۱

تیز تیز واپس ہوتے ہوئے قدموں کی آواز آئی۔

”یہ اس صورت حال سے بچنے کا بڑا اچھا طریقہ ہے، سام  
دیر کے مٹنی نے جیسے گرجتے ہوئے کہا: ”کیا تم خاموش نہیں رہ  
سکتے تھے۔ اب کوئی عجب نہیں کہ اس بے چاری صورت کو بے ہوشی  
دورہ پڑ جائے“

”تم بھول رہے ہو کہ یہ میرا گھر ہے اور تم محض ایک تجربہ ہو  
جو غلط ہو گیا ہے“ سام نے گرم ہوتے ہوئے کہا: ”میرا اتنا ہی  
حق ہے۔“

”بلکہ زیادہ حق ہے۔ ارے! یہ تم کیا کر رہے ہو؟“  
اس کے مٹنی نے کپڑوں والی الماری کھول لی تھی اور پتوں  
پہنے لگا تھا۔

”میں لباس پہن رہا ہوں۔ تمہارا جی چاہے تو ننگے ہی چہل قدمی  
کرتے پھرو، لیکن میں صورت شکل سے شریف اور معزز نظر آنا  
چاہتا ہوں“

”میں نے تو اپنی پیمائش لینے کے لیے لباس اتارا تھا۔ یہ  
میرے کپڑے ہیں۔ یہ میرا گھر ہے۔“

”دیکھو، اتنا گرم ہونے کی ضرورت نہیں“ اس کے مٹنی  
نے کہا: ”تم جو کچھ کہتے ہو، وہ عدالت میں کبھی ثابت نہیں کر سکو  
گے۔ مجھے وہ پرانی کہاوت دہرانے پر مجبور نہ کرو کہ تیرا مال سو  
میرا مال“



ہال میں بھاری قدموں کی چاپ سناٹی دے رہی تھی۔ قدموں  
کی یہ چاپ کمرے کے باہر آکر گڑ گڑ گئی۔ پھر ہال میں چپچپوں کی آوازیں  
سناٹی دیں۔ اس کے ساتھ ہی لکڑی کے جلنے کی بو آئی۔ سام  
دیر اور اس کے مٹنی دونوں نے پلیٹ کر دیکھا۔ کمرے کے  
چلتے ہوئے دروازے میں سے ایک لمبا ترننگا بوڑھا اور کوٹ  
میں ملبوس اندر داخل ہوا اندر داخل ہوئے وقت جھکا نہیں، بلکہ اس  
نے اپنا سر نیچے لباس کے اندر کر لیا اور کمرے میں داخل ہونے  
کے بعد اس کا سر پھر اُپر چلا گیا۔ غیر ارادی طور پر سام ویر اور اس  
کا مٹنی دونوں ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ بوڑھے کی آنکھیں  
واقعی خوفناک تھیں۔ انہیں دیکھ کر سام ویر کو حیا کی قفل نگار کے  
پہانوں کا خیال آگیا۔ بوڑھے کی نگاہیں محض دیکھتی نہیں، پیمائش  
اور تجزیہ کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

”مجھے خدشہ تھا کہ میں مجھے دیر نہ ہو جائے“ بوڑھے نے  
اپنی پراسرار آواز میں کہنا شروع کیا یہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم

نے اپنا مٹنی تیار کر لیا ہے اور مٹنی نے تحلیل مشین کو توڑ پھوٹ دیا ہے۔ بُرا ہو، بہت بُرا ہوا۔ اب مجھے اپنے ہاتھوں سے یہ کام انجام دینا پڑے گا، اور یہ بڑا ناخوشگوار کام ہے۔ وہ کچھ اور آگے بڑھ آیا۔ وہ دونوں اس کے وجود سے ایک ہیئت محسوس کر رہے تھے۔ اس نے کہا۔

”اس معاملے کی وجہ سے پہلے ہی ہمارے چار پر وگرام تلپٹ ہو چکے ہیں، لیکن ہمیں اپنی ہر کاروائی باضابطہ معاشرتی تقاضوں کے مطابق کرنی تھی۔ ہم مشین واپس لینے سے پہلے موصول کنندہ کی شخصیت کے بارے میں پورا اطمینان کر لینا چاہتے تھے، تاہم اس مکان کی مالک کے بے ہوش ہونے کی وجہ سے ہمیں ہنگامی اقدامات کا سہارا لینا پڑا۔“

سام ویبر کے مٹنی نے کھنکار کو گلا صاف کیا ”تم۔۔۔“

”میں تم جیسا انسان تو واقعی نہیں ہوں۔ میں تو صرف انسان ساز کمپنی کا ایک ادنیٰ ملازم ہوں۔ کمپنی کی طرف سے اس نیتسویں مستطیل کے لیے مجھے نگران مقرر کیا گیا ہے۔ تمہاری مشین اصل میں ان بچوں کے لیے تھی جو اس مستطیل کے تفریحی دورے پر آئے ہوئے ہیں۔ ایک اتفاقی غلطی کی وجہ سے یہ مشین تمہارے پاس پہنچ گئی، لیکن یہ غلطی اتنی مکمل تھی کہ ہمیں تمہارا پتہ چلانے کے لیے بالواسطہ طریقوں سے کام لینا پڑا۔“

کمپنی کے نگران لمبے ترننگے بوڑھے نے خاموش ہو کر سام ویبر اور اس کے مٹنی کی طرف دیکھا۔ سام ویبر بالکل برہنہ تھا۔ اُس یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بارہا بہشت میں آدم و حوا کے ڈرامے کا ایک کردار ہے۔ بوڑھے کی آواز پھر گونجی۔

”ہم مشین تو بہر حال واپس لے جائیں گے اور اس میں اگر کوئی خرابی واقع ہو گئی ہو تو اسے درست کر لیں گے۔ ایک

بار یہ معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو گیا تو پھر تمہیں اپنی زندگی کو اپنے معمول کے مطابق بسر کرنے کی اجازت ہوگی، لیکن فی الحال مسٹر سیسے کہ تم دونوں میں سے اصل سام ویبر کون ہے؟“

”میں ہوں۔“ دونوں کی آوازیں ایک ساتھ آئیں اور وہ ایک دوسرے کی طرف گھورنے لگے۔

سام ویبر نے سوچا کہ اس کا مٹنی اپنے آپ پر کس قدر احمقانہ اعتماد ظاہر کر رہا ہے۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ اس کے سامنے انسان ساز کمپنی کا نگران ہے جس کی ہر نگاہ سے کوئی شے چھپی نہیں رہ سکتی۔ وہ ایک نظر میں ہی ذہنی تفاؤ کا اندازہ کر لے گا۔ یہ کوئی آج کل کا شکل بچو ماہر نفسیات نہیں، بلکہ ایسی ہستی ہے جس کی نظروں کے سامنے ظاہر اور باطن یکساں ہیں۔

”یقیناً میں اس فرق کا پتہ چلا سکتا ہوں،“ بوڑھے کی آواز بلند ہوئی۔ ”ذرا ٹھہرو، ابھی اس کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔“

بوڑھے کی نگاہیں سام ویبر اور اس کے مٹنی کا غور سے جائزہ لینے لگیں۔ وہ انہیں سر سے سر تک بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں خاموشی سے اس کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ خاموشی ان کے لیے انتہائی سنگین تھی۔

”ہاں،“ آخر کار بوڑھے نے کہا یہ ہاں، مجھے پتا چل گیا ہے۔“

ایک دبلا پتلا طویل بازو بوڑھے کے جسم سے باہر لپکا۔ اس نے سام ویبر کو تحلیل کرنا شروع کر دیا۔

”لیکن سنو تو؟“ سام ویبر نے کہا۔ لیکن بوڑھے کے ہاتھ کی بدولت یہ چیخ بھی تحلیل ہو کر رہ گئی۔

”بہتر ہو گا کہ تم اپنا منہ دوسری طرف کر لو،“ بوڑھے نے کہا۔

سام ویبر کے مٹنی نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا اور قمیض کے بٹن بند کرنے لگا۔ اس کی پشت پر مسلسل ایک بڑبڑاہٹ جاری تھی جو کبھی اونچی ہو جاتی کبھی مدھم۔

”دیکھو، بات یہ ہے،“ بوڑھے کی آواز آئی۔ ”یہ تحفے کا نہیں، اصول کا معاملہ ہے۔ تمہاری تہذیب ابھی اس کے لیے تیار نہیں ہے۔“

”جی ہاں،“ سام ویبر کے مٹنی نے بڑے ادب سے جواب دیا۔ ”آپ بالکل درست فرماتے ہیں۔“

اور پھر وہ خالہ میگی کی دی ہوئی ایک ٹائی اٹھا کر اس کی گرہ باندھنے لگا۔

